UNIVERSAL LIBRARY
OU_222056
UNIVERSAL LIBRARY

ش-1 ۸۹۱۵۶۹

رکھی 41/6226

شیگر

30/9/66 ۴۴۰۴

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۴ Accession No. ۱۷۴۴۷

Author ش.و تنقور 16266

Title زندگی

This book should be returned on or before the date last marked below.

انارکلی

شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور

مترجم
رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

آزاد بک ڈپو - لاہور

کتب خانہ

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ

بار اول ۱۹۴۵ء ایک روپیہ بارہ آنے

فہرس

یہ کون	۵
انصاف	۱۸
کابلی والا	۲۴
انارکلی	۳۷
شادی	۶۹
بیوہ	۸۸
بدھو کے پتھر	۹۵
دروازہ	۱۳۰

یہ کون!

(۱)

"ڈاکٹر! ڈاکٹر!"

میں نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ تو ہمارے زمیندار دکشنا چرن بابو سامنے کھڑے تھے۔ میں جھٹ اُٹھا۔ گھڑی دیکھی تو رات کے ڈھائی بجے تھے۔

دکشنا چرن منہ بگاڑ کر بولے "آج پھر وہی واقعہ پیش آیا!"

میں نے کہا "شاید آپ نے شراب کی مقدار بڑھا دی۔"

دکشنا بابو بگڑ کر بولے "یہ شراب کا اثر نہیں۔ آپ شروع سے آخر تک سب حال سنے بغیر اصلی سبب نہ جان سکیں گے۔"

مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ میں نے اس کی روشنی تیز کر دی۔ اور

چادر اوڑھ کر بیٹھ گیا۔

دکشنا بابو کہنے لگے "اگرچہ میری پہلی استری کے برابر دوسری کا ملنا کٹھن تھا۔ مگر اس زمانہ میں میری عمر چھوٹی اور طبیعت میں عاشقی بہت تھی۔ اچھے اچھے پاتر دیکھے تھے۔ اس لئے اپنی استری کا گرہستی کی طرح رہنا اچھا نہ لگتا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی اس سے عشق کی گفتگو کرتا۔ تو وہ میری باتوں کو ہنسی میں اڑا دیتی۔ اس کی ہنسی سے میری آرزوؤں اور امیدوں کا خاتمہ ہو جاتا۔

"چار برس ہوئے۔ مجھے بخار آنے لگا۔ جینے کی امید نہ رہی۔ اور ایک دن تو ڈاکٹر نے بھی جواب دے دیا۔ اُس وقت میرے ایک دوست کہیں سے ایک برہمچاری کو لائے۔ اُس نے دودھ گھی کے ساتھ مجھے ایک دوا پیس کر دی۔ اور میں اس دوا کے اثر یا قسمت کی خوبی سے بچ گیا۔ بیماری میں میری استری نے تن من دھن سے خدمت کی۔ دروازہ پر بیٹھ کر اپنی ستیتا کے تیج سے یم راج کا مقابلہ کیا۔ اُسے نہ کھانے کی سدھ تھی نہ پینے کی۔ نہ گھر سے مطلب تھا۔ نہ دنیا سے یم راج مجھے تو چھوڑ گئے۔ مگر جاتے جاتے اس پر چوٹ کر گئے۔ وہ اس وقت حاملہ تھی۔ پرسوت کے بخار اور طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئی۔ میں نے اس کی خدمت شروع کی۔ مگر اس نے مجھ سے خدمت کرانا منظور نہ کیا۔ ہمارا برہان نگر والا گھر تو آپ نے دیکھا ہی ہے۔ گھر کے سامنے باغ ہے۔ اور باغ کے سامنے گنگا جی بہتی ہیں۔

اس کے ایک حصہ میں میری استری نے اپنی خواہش کے مطابق اپنے ہاتھ سے پھولوں کا کنج لگایا تھا۔ اس میں بیلہ گلاب وغیرہ کے پیڑ تھے۔ ایک مولسری کے بوٹے کے نیچے سنگ مرمر کا چبوترہ تھا۔ گرمی کے دنوں میں شام کو ہم دونوں اس چبوترہ پر بیٹھ جاتے تھے

بہت دن تک چارپائی پر پڑے رہنے سے میری استری اُکتا گئی۔ تو مجھ سے کہنے لگی میرا جی گھبراتا ہے۔ آؤ آج باغ میں چل کر بیٹھیں۔

میں بڑی کوشش سے اس کو سہارا دے کر آہستہ آہستہ باغ تک لے گیا۔ اور اس چبوترہ پر بٹھا دیا۔ ایک ایک دو دو کر کے مولسری کے پھول گرنے لگے۔ چاند کی روشنی ڈالیوں اور پتوں کے اندر سے ہوتی ہوئی اُس کے بے رونق چہرہ پر پڑتی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ میں بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے اَور پاس جا کر اس کا دُبلا پتلا ہاتھ پکڑا۔ کچھ دیر یونہی چپ رہنے کے بعد دل آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے کہا۔ تمہاری محبت مجھے عمر بھر نہ بھولے گی۔

یہ سُن کر میری استری ہنس دی۔ اس ہنسی میں علم و حیا کے ساتھ بے اعتمادی بھی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ کا مطلب یہ تھا۔ کہ یہ ممکن ہی نہیں تم مجھے کسی وقت نہ بھولو۔ نہ میں ایسی امید ہی کرتی ہوں

اس دلاویز مگر تلخ ہنسی کے ڈر سے میں نے پھر کبھی محبت کا ذکر نہیں چھیڑا۔ جو باتیں دل میں پیدا ہوتیں۔ اس کے سامنے جاتے ہی نامعلوم کہاں جاتیں۔ کتابوں میں جن باتوں کے پڑھنے سے آنکھوں میں آنسو بہنے لگتے ہیں۔ نامعلوم اُن کے سننے سے اُسے کیوں ہنسی آتی تھی۔

(۲)

بہت دوا دوش کے باوجود میری استری کی صحتیابی کے آثار نظر نہ آئے تو ڈاکٹر نے آب و ہوا کی تبدیلی کا مشورہ دیا اور میں اسے لے کر الہ آباد چلا گیا۔ وہاں ہرنا تھ بابو اس کا علاج کرنے لگے۔ مگر چند ہی روز بعد معلوم ہو گیا۔ کہ یہ روگ جانے والا نہیں۔ یہ جاننے کے بعد کہ اب دائم المریض رہ کر ہی زندگی بسر کرنی ہو گی۔ ایک دن میری استری نے مجھے مذاق سے کہا۔ تم ایک شادی اور کر لو۔

جس پر بڑی سنجیدگی اختیار کر کے میں نے کہا " جب تک میرے جسم میں جان ہے ......"

میری بات کاٹ کر اُس نے کہا " ایسا نہ کہو۔ تمہاری بات سن کر مجھے دُکھ ہوتا ہے "

میں نے اب بھی ہار نہ مانی۔ پھر بول اُٹھا " اس زندگی میں میں اور کسی سے محبت نہ کروں گا "

یہ سُن کر میری استری زور سے ہنسی۔ میں چپ ہو گیا۔ اس کی

خدمت کرتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں برہمچریہ رہنے کا عہد کر لیا تھا۔
ڈاکٹر ہرناتھ کی اور ہماری ذات ایک تھی۔ اُن کے گھر میں اکثر کھانا کھاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر نے اپنی لڑکی منورما سے میری ملاقات کرا دی۔ اُس کی شادی ابھی نہ ہوئی تھی۔ اُس وقت اس کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ بابو ہرناتھ کہتے تھے۔ کہ یوگیہ ور ملنے سے ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی۔ لڑکی خوبصورت اور پڑھی لکھی تھی۔ اس لئے اس سے باتیں کرتے ہوئے گھر آنے میں دیر ہو جاتی اور استری کو دوا دینے کا وقت نکل جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ کہ میں ہرناتھ بابو کے گھر جاتا ہوں۔ مگر دیر ہونے کا سبب اُس نے ایک دن بھی نہیں پوچھا۔

(۳)

پیاسے مسافر کو ریت میں پانی کا سراب نظر آتا ہے۔ میرے دل میں محبت کی پیاس تھی۔ سامنے صاف اور ٹھنڈا پانی جھکورے لے رہا تھا۔ اپنی طبیعت کو نہ روک سکا۔ اب مریض کی صحبت شاق ہوتی تھی۔ خدمت کرنا اور دوا دینا بھی وقت طلب ہو گیا۔ ہرناتھ بابو کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔ جس مریض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو اُس کا مرنا ہی بھلا ہے۔ ایک دن میں نے اپنے کمرہ میں سنا میری استری ڈاکٹر سے کہہ رہی ہے۔ ڈاکٹر بابو۔ جب میں اچھی ہی نہیں ہو سکتی۔ تو مہربانی سے ایسی دوا دو۔ جس سے پران جلد چھوٹ جائیں

یہ باتیں سُن کر میرے دل پر چوٹ لگی۔ ڈاکٹر کے چلے جانے پر میں اپنی استری کی چارپائی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اُس نے کہا۔ یہاں گرمی ہے۔ ہوا خوری کر آؤ۔ ورنہ رات کو بھوک نہ لگے گی۔ ہوا خوری کا مطلب ڈاکٹر بابو کے گھر جانے سے تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا۔ کہ بھوک لگنے کے لئے تھوڑا سیر کرنا اچھا ہوتا ہے۔ اب میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ میری چالبازیوں کو خوب سمجھتی تھی۔ مگر اُس وقت یہی خیال کرتا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتی۔

ایک دن ڈاکٹر بابو کی لڑکی نے میری استری کو دیکھنے کی خواہش کی۔ نہ معلوم مجھے یہ بات کیوں اچھی نہ لگی۔ مگر میں اُسے روک بھی نہ سکا۔ ایک دن شام کو وہ میرے گھر آئی۔ اُس دن میری استری کو اور دنوں سے زیادہ تکلیف تھی۔ منہ نیلا ہو گیا تھا۔ اور ہاتھ کی مٹھیاں کسی ہوئی تھیں۔ اُس دن اُس میں اتنی طاقت نہ تھی۔ کہ مجھ سے ہوا خوری کے لئے کہتی۔ اس کی آنکھوں کو روشنی سے بچانے کے لئے چراغ دروازہ کے پاس رکھا ہوا تھا۔ گھر میں اندھیرا اور سناٹا تھا۔ اُس وقت منورما دروازہ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے سے چراغ کی روشنی اُس کے چہرہ پر پڑی۔ وہ دروازہ پر چپ چاپ کھڑی تھی۔ میری استری اسے دیکھ کر چونک گئی۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولی "یہ کون!" غالباً اس ضعف

ونقاہت میں وہ ایک اجنبی صورت کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ دو تین بار مجھ سے پوچھا یہ کون! یہ کون! یہ کون! نہیں معلوم میری عقل پر کیا پردہ پڑ گیا کہ میں بول اٹھا "میں نہیں جانتا۔"

اتنا کہتے ہی ایسا معلوم ہوا۔ گویا کسی نے میرے دل پر کاری ضرب لگا دی بے اختیار منہ سے نکلا "او ہو" یہ تو ہمارے ڈاکٹر بابو کی لڑکی ہے۔"

میری استری نے میری طرف دیکھا لیکن میں اس کی طرف نہ دیکھ سکا۔ اس نے ڈاکٹر بابو کی لڑکی کو اندر بلایا۔ اور مجھ سے چراغ لانے کو کہا۔ منورما اندر بیٹھ گئی۔ اور میری استری آہستہ آہستہ اس سے باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں ڈاکٹر بابو آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ دوا کی دو شیشیاں لائے تھے۔ انہوں نے شیشیاں نکال میری استری سے کہا۔ اس نیلی شیشی میں مالش کرنے کی دوا ہے۔ اور دوسری میں کھانے کی۔ دیکھو دونوں کو ملا نہ دینا۔ نیلی شیشی والی دوا زہر ہے۔ چلتے وقت ڈاکٹر نے اپنی لڑکی کو بلایا۔ مگر جب منورما کو لیکر جانے لگے تو میری استری نے کہا۔ "ڈاکٹر بابو یہ بڑی دیر سے اندھیرے میں بیٹھے ہیں۔ ان کو بھی ذرا گھما لائیے" میں نے برائے نام عیل حجت کی۔ پھر چلنے کو تیار ہو گیا۔

ڈاکٹر نے چلتے چلتے دوا کے لئے پھر تاکید کی۔

اس دن میں نے ڈاکٹر کے گھر پر بھوجن کیا۔ گھر آتے آتے

رات ہو گئی۔

(۴)

واپس آ کر دیکھا۔ تو میری استری کی حالت خراب تھی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ کیا زیادہ تکلیف ہے؟ وہ جواب نہ دے سکی۔ چپ چاپ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔ بظاہر گلا بند ہو گیا تھا۔ میں نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر بابو پہلے تو کچھ نہ سمجھے پھر بولے "تعجب ہے تکلیف اتنی بڑھ گئی۔ معلوم ہوتا ہے دوا کی مالش ایک بار بھی نہیں ہوئی۔ یہ کہہ کر انہوں نے شیشی کو دیکھا۔ مگر وہ خالی تھی۔

ڈاکٹر نے گھبرا کر کہا" ارے کیا تم نے یہ دوا پی لی؟"

میری استری نے گردن ہلا کر جواب دیا" ہاں" ڈاکٹر پمپ لینے گاڑی پر گھر گیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اور بے ہوش سا ہو کر اپنی استری کے بچھونے پر گر پڑا۔

جس طرح ماں اپنے دکھی بچہ کو ڈھارس دیتی ہے۔ اسی طرح میری استری نے میری گردن میں باہیں ڈال کر مجھے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ شکستہ جملوں میں اس نے اتنا ہی کہا" رنج مت کرنا۔ جو ہوا اچھا ہوا تم سکھی رہو گے۔ یہی جان کر میں سکھ سے مرتی ہوں"

جس وقت ڈاکٹر صاحب لوٹ کر آئے۔ تو زندگی کے ساتھ ساتھ میری پیاری استری کی ساری تکلیفوں کا خاتمہ ہو چکا تھا!

(۵)

منورما سے شادی کر کے اور اُسے اپنے ساتھ لے کر میں اپنے وطن کو لوٹا۔

منورما نے اپنے والد کی صلاح سے مجھ سے شادی کی تھی۔ مگر جب کبھی اس سے محبت کی باتیں کرتا۔ اور اس کے دل پر قابو پانے کی کوشش کرتا۔ تو وہ ہنسنے کے بدلے سنجیدہ ہو جاتی۔ میں نہیں جانتا اس کی وجہ کیا تھی۔

ایک دن سر شام منورما کو ساتھ لیکر میں اپنے باغ کی سیر کرنے گیا۔ جھٹ پٹا ہو چلا تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد جب منورما تھک گئی۔ تو اسی سنگ مرمر کے چبوترہ پر لیٹ گئی اور دونو بازو سر کے نیچے رکھ لئے۔ میں بھی پاس بیٹھ گیا۔ درختوں کے سایہ میں اُس جگہ اور بھی اندھیرا تھا جہاں تک نظر جاتی تھی۔ آسمان تاروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اتنے میں ایسا معلوم ہوا۔ گویا جھاڑیوں اور درختوں کی چوٹیوں کو آگ سی لگ گئی ہے۔ اس کے بعد کرشن پکش کا پہلا چاند آہستہ آہستہ درختوں کے اوپر آسمان پر چڑھنے لگا۔ سپید پتھر پر سپید ساری پہن کر لیٹی ہوئی میری استری پر چاند کی سپید روشنی پڑی۔ تو بے اختیار طبیعت پر کیف وجدان طاری ہوا۔ پاس سرک کر میں نے منورما کے دونو ہاتھ پکڑ لئے اور کہا "منورما تم شاید نہ مانو مگر میں سچ کہتا ہوں۔ کہ تم سے مجھے

وہ گہری محبت ہے جسے میں کسی حال میں نہ بھولوں گا۔"

اتنا کہتے ہی میں چونک گیا۔ یاد آیا کہ ایسے ہی الفاظ ایک اور موقعہ پر کسی اور سے کہے تھے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ آسمان پر ایک قہقہہ کی آواز سنائی دی۔ ہوش آنے پر دیکھا۔ تو گھر میں اپنے بستر پر پڑا تھا!

تو کیا جو کچھ میں نے دیکھا وہ محض ایک خواب تھا!

میری استری نے اس وہم کو دور کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ دور نہ ہوا۔ شام ہوتے ہی ہر طرف ہنسی کی پراسرار آوازیں سنائی دیتیں۔ منورما سے ذکر کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کچھ دنوں یہی حال رہا تو میں نے برہان نگر والا گھر چھوڑ دیا اور منورما کو ساتھ لیکر کشتی کا سفر کیا۔

اگھن کا مہینہ تھا۔ ندی کی تازہ ہوا نے عہد شباب کے ولولوں کو تازہ کر دیا۔ وہ فرضی خوف بھی دور ہو گیا۔ کئی دن بڑے سکھ میں گزرے منورما بھی دریا کی خیال انگیز محویت سے متاثر ہو کر زیادہ محبت کرنے لگی۔ گنگا کو چھوڑ کر آخر ہم پرماندی میں پہنچے۔ دریا کے شمال میں بالو کا وسیع میدان تھا۔ جہاں ریت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہاں خشکی پر پھرنے کی سہولت دیکھ کر میں نے ناؤ باندھ دی اور عارضی قیام کیا۔

ایک دن ہم پھرتے پھرتے بہت دور نکل گئے۔ غروب آفتاب کی سنہری کرنوں سے ملتی ہوئی چاند کی ہلکی روشنی آہستہ آہستہ پھیلنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ اس وسیع ریگستان میں اور آسمان پر چاروں

طرف پھیل گئی۔ اس وقت کیسا دل کش سماں تھا! ایسا معلوم ہوتا تھا۔ دو راہ روان عشق چاند کی دنیا میں سیر کرنے جا رہے ہیں منور ما سرخ شال اوڑھے ہوئے تھی۔ اتنے میں چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ یکا یک منور ما نے شال سے ہاتھ نکال کر میرا ہاتھ پکڑا۔ اور میرے پاس آکر اس طرح کھڑی ہو گئی گویا اپنا تن من دھن جوبن اور زندگی سب کچھ مجھ پر نثار کرنے کو تیار ہے۔ میری خوشی کا کیا ٹھکانا تھا۔ خیال آیا۔ ایسی محبت ایسے ہی پر فضا منظر میں ہو سکتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ نہ کہیں ہمارا گھر ہے۔ نہ ہمیں کہیں لوٹ کر جانا ہے۔ اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ دیئے چلتے رہنا ہے۔ ایک جگہ ریت کے گڑھے میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس پانی میں چاند کا عکس ایک عجیب سرور انگیز منظر پیدا کرتا تھا ہم دونوں اس نظارہ کو دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت اس وسیع ریگستان میں جہاں کسی انسان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ کسی نے تین بار کہا۔ یہ کون! یہ کون! یہ کون!

میں چونک گیا۔ میری استری بھی کانپنے لگی۔ مگر آنکھ اٹھانے پر معلوم ہوا۔ کہ آواز کسی آدمی کی نہ تھی۔ کسی آبی پرندہ کی ہانک تھی۔ جو شاید اس ویرانہ میں انسانوں کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

مگر ایک بار ڈرنے کے بعد ہمیں آگے جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ ہم

ناؤ کی طرف لوٹے۔ منورما تو تھک کر سو گئی۔ مگر میں جاگتا رہا۔

تھوڑی دیر میں ایسا معلوم ہوا۔ کوئی مسہری کے پاس کھڑا اپنی خشک استخوانی انگلی سے منورما کی طرف اشارہ کر کے آہستہ آہستہ میرے کان میں کہتا ہے۔ یہ کون! یہ کون! یہ کون!

میں نے اُٹھ کر چراغ جلایا۔ دیکا یک مسہری ہلی۔ اس کے ساتھ ہی ایک پراسرار قہقہ کی آواز سنائی دی۔ جو ناؤ کو ہلاتی اور میرے خون کو منجمد کرتی ہوا میں مرتعش ہو کر پدما کو عبور کر کے گاؤں اور قصبوں کے پار گمزور رہوتی ہوئی دور تک چلی گئی۔ آواز بند ہو گئی۔ مگر میرا دماغ اس کی یاد سے آزاد نہ ہوا۔ چاروں طرف سے یہی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ کون! یہ کون! یہ کون!

رات کے سناٹے میں ناؤ کی الماری پر رکھی ہوئی بے جان گھڑی بھی کہہ رہی تھی۔ یہ کون! یہ کون! یہ کون!

پانی کی لہروں سے ایک پراسرار آواز سنائی دیتی تھی۔ یہ کون! یہ کون! یہ کون!

اتنا کہہ کر دکشنا چرن بابو کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور حلق خشک ہو گیا۔ میں نے تھوڑا سرد پانی پیش کیا۔ جس سے ان کی طبیعت سنبھلی۔

اسی وقت چراغ بجھ گیا۔ دیکھا تو سویرا ہو چکا تھا۔ چڑیاں بولنے لگی تھیں۔

دن کی روشنی میں کرشنا چرن بابو کا انداز بالکل بدل گیا۔ جو قصہ انہوں نے اس ہولناک پیرایہ میں مجھ سے بیان کیا تھا۔ اسکے لئے خود ہی شرمندہ ہوئے اور کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔

اس دن آدھی رات کو میرے دروازہ پر پھر انکی معروف آواز سنائی دی۔ ڈاکٹر! ڈاکٹر!

انصاف

(۱)

جب کھروا کی جوانی ڈھل چکی۔ اور اس کا آخری چاہنے والا بھی اسے رات کو سوتا ہوا چھوڑ کر چلا گیا۔ تو پھر اس کی آنکھیں کھلیں۔ اس وقت اس نے محسوس کیا۔ کہ ۳۸ سال گناہ کی زندگی بسر کرنے کے بعد میرے پاس زہر کھانے تک کو کوڑی نہیں ہے۔ ہائے افسوس! ان لوگوں میں جو اس پر جان نثار کرنے کو تیار رہا کرتے تھے۔ اب ایک بھی ایسا نہیں جو باقی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ صد حیف! ساری عمر گنوا کر ایک پھوس کا جھونپڑا بھی ایسا نہ ہوا۔ جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ اور جس میں زندگی یا موت کے دن پورے کرے۔ وہ دیکھتی تھی کہ چاہنے والوں کی طرح اسباب ہستی بھی اس سے بے رحمانہ

سلوک کر رہے ہیں۔ اور افلاس کی تنگی کے باوجود زندگی کے تکلیف دستور ہیں۔ اب جو اس نے آمدنی کی قلت اور خرچ کی کثرت پر غور کیا تو ہجوم یاس نے بھیانک صورت اختیار کر کے خوف زدہ کر دیا۔ اور وہ اینٹوں کے سخت فرش پر اوندھی لیٹ کر زار زار رونے لگی۔

شام ہو گئی۔ اور ہر طرف تاریکی پھیلنے لگی لیکن کھرودا میں اتنی ہمت نہ تھی۔ کہ اُٹھ کر کمرہ ہی جھاڑ دیتی یا چراغ جلاتی۔ اس کا بھوکا بچہ دن بھر دو تار ہا۔ اتنا رویا کہ گھگی بندھ گئی۔ اور آخر تھک ہار کر چارپائی کے نیچے پڑا پڑا سو گیا۔ اتنے میں باہر کے دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ اور آواز آئی "کھرو" "کھرو"

کھرودا غصہ سے جلی بھنی بیٹھی تھی۔ جھاڑو ہاتھ میں لیکر دروازہ کھولنے گئی۔ اس کی قہر آلود صورت دیکھ کر وہ نوجوان جو کھرودا سے محبت کرنے آیا تھا سر پاؤں پر رکھ کر بھاگا۔ بدنصیب عورت نے غصہ سے سوتے ہوئے بچہ کو گود میں لیا۔ اور پاس ہی کنوئیں میں کود گئی۔

آواز سُن کر ہمسایہ کے لوگ جمع ہو گئے۔ اور ماں بچہ کو باہر نکالا۔ کھرودا بیہوش تھی۔ مگر بچہ مر چکا تھا۔ ماں کو ہسپتال میں پہنچایا گیا۔ جہاں اُسے ہوش آگیا۔ جب اس کی صحت بحال ہوئی۔ تو اقدام خودکشی اور قتل کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ اور صاحب مجسٹریٹ نے تحقیقات کرنے کے بعد اُسے سشن سپرد کر دیا۔

(۲)

صاحب سشن جج کا نام موہن دت تھا۔ انہوں نے مقدمہ کی سماعت کے بعد مجرم داکو پھانسی کا حکم سنایا۔ وکیلوں نے سزا میں تخفیف کی بہت کوشش کی۔ مگر بے سُود۔

بات یہ تھی کہ جج صاحب کمزور اخلاق کی عورتوں پر خاص طور سے سختی کیا کرتے تھے۔ یہ کیوں! اس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے اُن کی زندگی کے بعض ابتدائی حالات پر غور کرنا ضروری ہے۔

موہن بابو کالج کی تعلیم کے دنوں میں ایک عمر رسیدہ میاں بی بی کے گھر کے پاس رہا کرتے تھے۔ ان کی ایک جوان بیوہ لڑکی تھی جس کا نام سسی تھا۔ اپنی بیوگی کی تنہائی میں سسی کو جس قدر ظاہری دُنیا نظر آئی۔ وہ اُسے ایک پراسرار سنہری زمین کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ جس پر راحت و آرام کا راج ہو۔ یہ حالت دیکھ کر اس کے سینہ میں تمنا و حسرت کا سمندر موجزن ہونے لگا جس کی لہریں اس کے دل کی تیز حرکت کی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔

سسی کو جس وقت گھر کے کام سے فرصت ہوتی۔ تو کھڑکی میں بیٹھ کر سڑک پر گزرنے والوں کی طرف دیکھا کرتی اور سوچتی تھی کہ یہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں۔ زندگی کے ناٹک میں آوارہ گرد تماشائی اس کو سب سے زیادہ خوش و خورم نظر آتے تھے۔ اسی گروہ میں جوشِ جوانی میں مخمور نوجوان موہن صبح و شام کالج کو جاتے آتے سامنے سے گزرتا

تھا۔ شباب کے دن تھے۔ اور کالج کی آزادی ہر وقت بناؤ چناؤ کی فکر رہتی تھی سسی کی نظر اس پر خاص طور سے پڑتی تھی۔ اسکی نظر دل میں وہ ہستی خاص کا درجہ رکھتا تھا جس کی ذات کو باقی رہرووں کے ہجوم پر ایک خاص تفوق حاصل تھا۔

ممکن ہے سسی تخیل کے آسمان پر اپنے بہادر کے ساتھ خیالی خوشیاں مناتے ہوئے اسی طرح عمر گزار دیتی۔ مگر اس گھڑی کا برا ہو جس میں موہت اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس تبسم میں نہ معلوم کونسی بجلی تھی۔ کہ اس کی روشنی میں سسی کو وہ خیالی آسمان بالکل قریب اور سہل الحصول دکھائی دینے لگا۔ یہ بیان کرنا لاحاصل ہے کہ موہت کی للچائی ہوئی نظریں اول مرتبہ کب سسی پر پڑیں۔ اور کب سے۔ اس نے بندو کا فرضی نام اختیار کر کے اس سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ مختصر یہ ہے۔ کہ راحت موہوم نے سسی کی آنکھوں میں دنیا اندھیر کردی۔ ایک آندھی تھی۔ جو اس کی پیش بینی کو جڑ سے اکھاڑ کر لے گئی۔ اور اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں غلط املا میں لکھا ہوا جواب بندو کے نام بھیج دیا۔

اس کے چند دن بعد اندھیری رات میں سسی اپنے والدین کے گھر سے نکلی۔ سڑک پر ایک بند گاڑی تھی وہ اس میں داخل ہوئی۔ کیا یہ بتانے کی حاجت ہے۔ کہ اس گاڑی کو وہاں لانے والا بندو عرف موہت تھا؟

مگر جب اس کا خیال بہادر اپنی فرضی نمود و نمائش کے ساتھ اس کے پیچھے گاڑی میں سوار ہوا۔ اور کھڑکی بند کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تو پشچاتاپ کی ایک فوری لہر نے سسی کے ہر ایک رونگٹے میں کپکپی پیدا کر دی۔ اتنے میں گاڑی چلنے لگی تھی۔ سسی فوراً اٹھ کر بنود کے قدموں پر گری اور رو کر کہنے لگی "پرماتما کے لئے مجھے اتر جانے دو" مگر اس وقت تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

(۳)

اب موہن دت کے چلن میں اصلاح عظیم واقع ہو چکی تھی۔ وہ شب روز مقدس کتابیں پڑھتا۔ اور ریاضت کرتا تھا۔ دنیا اسکے کارناموں کو فراموش کر چکی تھی۔ مگر ایک جان زندہ تھی۔ جو اب تک اس کی کمزوریوں سے واقف تھی۔

کھرودا کا مقدمہ فیصل ہونے کے چند دن بعد کا ذکر ہے۔ کہ موہن بابو کچھ پھل اور سبزی لانے جیل خانہ کے باغ میں پہنچے۔ وہاں دو آدمی ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ جج صاحب اندر گئے تو معلوم ہوا۔ کھرودا ایک سپاہی سے جھگڑا کر رہی ہے۔ موہن بابو کے چہرہ پر فاضلانہ تبسم نمودار ہوا۔ دل میں کہنے لگے "یہ ان عورتوں کی حالت ہے۔ موت سامنے کھڑی ہے۔ مگر تکرار سے باز نہیں رہ سکتی۔ شاید دوزخ میں داخل ہوتے وقت وہاں بھی دربانوں سے لڑیگی۔"

قریب پہنچے تو کھرودا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "جج بابو مہربانی سے میری انگوٹھی واپس لے دو"

معلوم ہوا کھرودا نے ایک انگوٹھی اپنے بالوں میں چھپا رکھی تھی جو سپاہی نے اس سے چھین لی۔

موہن بابو حیرت زدہ ہو گئے خیال آیا۔ پھانسی کے تختہ کے پاس کھڑے ہو کر کس نکمی چیز کے لئے جھگڑا ہو رہا ہے۔ سچ ہے اے عورت ذات تیرا نام کمزوری ہے! پھر سپاہی سے مخاطب ہو کر بولے "دیکھوں تو انگوٹھی کیسی ہے؟"

مگر انگوٹھی کو ہاتھ میں لیتے ہی موہن بابو اس طرح بھڑکے جیسے کسی نے جلتا ہوا کوئلہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا ہو۔ انگوٹھی کے نگینہ میں ہاتھی دانت پر بنی ہوئی ایک بے ریش نوجوان کی چھوٹی سی تصویر تھی۔ اور اندر کی طرف نبود کا نام کندہ تھا۔ انہوں نے انگوٹھی سے نظر ہٹا کر پہلی مرتبہ کھرودا کے چہرہ کو غور سے دیکھا تو اس وقت پھر انہیں ۲۴ سال پہلے کا وہی آنسوؤں سے تر کھبرایا اور معصوم چہرہ دکھائی دیا۔ جو اس رات ان کے قدموں پر پڑا تھا۔ مگر آہ! اب اس میں کتنا انقلاب واقع ہو چکا تھا!

کابلی والا

میری پنج سالہ بچی منی ایک لمحہ کے لئے خاموش نہیں رہ سکتی مجھے یقین ہے کہ اس نے اپنی تمام عمر میں ایک لمحہ بھی خاموشی میں ضائع نہیں کیا۔ اسکی ماں اکثر اس سے تنگ آکر اُسے کوستی لیکن میں نہیں میرے نزدیک منی کو خاموش دیکھنا غیر فطرتی بات ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لئے میں اس کے ساتھ ہمیشہ محبت بھری باتیں کرتا ہوں۔

ایک صبح جبکہ میں اپنے نئے ناول کے سترھویں باب کا آدھا حصہ پڑھ چکا تھا۔ میری چھوٹی سی منی میرے کمرے میں گھس آئی۔ اور میرے ہاتھوں میں ہاتھ دیتے ہوئے بولی:-

"ابا۔ رام دیال نوکر کو۔ کوّا کہتا ہے۔ اُسے کچھ نہیں آتا۔ کیا اُسے کچھ آتا ہے"؟

پیشتر اس کے کہ میں اُسے زبانی اختلاف بتاتا۔ جو کہ دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے۔ اُس نے ایک اور سوال کر دیا۔

"ابّا تمہارا کیا خیال ہے؟ بھولا کہتا ہے۔ بادلوں میں ایک ہاتھی چھپا ہوا ہے۔ جو کہ اپنی سونڈ سے پانی برساتا ہے۔ اسلئے تو بارش ہوتی ہے"

اور تب ایک نیا سوال کر دیا۔ جبکہ میں اُسکے پہلے سوال کا جواب دینے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔

"ابّا۔ منی نے کہا۔ امّاں کا اور آپ کا کیا رشتہ ہے"؟

میری بیوی ہے۔ میں نے خود اسے کہا۔ اور میرے پُرغم غصہ ظاہر کرتے ہوئے منی کو حکم دیا۔

"منی جاؤ۔ کیسو کے ساتھ کھیلو۔ میں مصروف ہوں"

میرے کمرے کی کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی ہے۔

بچہ میرے نزدیک ہی میرے قدموں میں بیٹھا ہوا کھیل رہا تھا۔ اور میں سترھویں باب کا وہ حصہ بڑے انہماک کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ جہاں کہ میرے ناول کا ہیرو پرتاپ سنگھ نے کنچن لتا کو ہاتھوں پر اُٹھائے قلعہ کی تیسری منزل کی ایک کھڑکی سے بھاگ رہا تھا۔ یکایک منی نے اپنا کھیل بند کر دیا۔ اور چلاتی ہوئی کمرے

کی کھڑکی کی طرف بھاگی۔

"کابلی والا ——— کابلی والا

واقعی نیچے گلی میں سے کابلی والا گزر رہا تھا۔ وہ اپنے ملک کے موٹے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ سر پر لمبی سی لمبی سی پگڑی تھی ۔ اور ہاتھوں میں انگوروں کے ڈبے اٹھائے ہوئے تھا۔

مجھے معلوم نہیں۔ کہ اس آدمی کے متعلق میری منی کے کیا خیالات تھے۔ لیکن اس نے اسے زور زور سے پکارنا شروع کر دیا۔

"آؤ" میں نے خیال کیا۔ کہ ابھی وہ اندر آجائے گا۔ اور میرا سترھواں باب کبھی بھی ختم نہ ہو گا۔

عین اسی وقت کابلی والے نے مڑ کر بچے کو دیکھا۔ اس کو بہت ڈر لگا۔ اور اپنی ماں کے آغوش میں چھپنے کے لئے بھاگی اور غائب ہو گئی منی کا خیال تھا۔ کہ کابلی والے کی پشت پر جو صندوقچہ ہے (جسے ایک آدمی نے اٹھایا ہوا ہے) اس میں اس کی عمر کے ہی دو تین بچے ہیں۔

یہ پھیری والا اتنے میں میرے کمرے میں آگیا۔ اور متبسم لہجہ میں مجھے دعائیں دیں میرے ناول کے ہیرو اور ہیروئن کی حالت نازک تھی۔ تاہم مجھے اس سے کچھ خریدنا ہی پڑا۔ اگر کوئی آ جائے۔ تو اسے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ چلا جا۔ اس خرید و فروخت کے دوران میں ہم میں روسیوں۔ انگریزوں اور سرحدی

پالیسی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اور جب وہ جانے لگا۔ تو اُس نے پوچھا؛

"چھوٹی بچی کہاں ہے۔ جناب؟"

• میں نے اس خیال سے کہ منی کا جھوٹا خطرہ مٹ جائیگا۔ اُسے باہر بلالیا۔ وہ میری کرسی کے قریب کھڑی، کابلی والے اور اسکے صندوقچے کو دیکھتی رہی۔ اُس نے کابلی خروٹ اور چھوہارے اُسے دیئے لیکن منی خوف سے میری ٹانگوں کے ساتھ چمٹی گئی۔ یہ اُن کی پہلی ملاقات تھی۔

ایک صبح اس سے کچھ عرصہ بعد جبکہ میں اپنے گھر سے باہر چلا جارہا تھا۔ تو میں یہ دیکھ کر چونک سا ہو گیا۔ منی دروازے کے قریب بیٹھی ہوئی کابلی والے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی جو کہ اس کے قدموں کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔

اُس نے اپنی تمام عمر میں، مجھے بھی معلوم ہوا۔ کہ سوائے اپنے باپ کے اتنا صابر دیکھنے والا نہیں دیکھا تھا۔ منی کی ساری کا آنچل باداموں اور چھوہاروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ کابلی والے کا تحفہ تھا۔ جو کہ اُسے دیکھنے آیا تھا۔

"تم نے یہ پھل اُسے کیوں دیئے"، میں نے کہا۔ اور جیب سے آٹھ آنے نکال کر دے دیئے۔ اُس شخص نے پیسے لے لئے اور جیب میں ڈال لئے۔ لیکن افسوس ایک گھنٹے کے بعد جب میں واپس آیا۔ تو

اپنی بیوی کو گھر لیا اور بیٹھے ہوئے سنا۔ بیچاری منی سے سوال پوچھے جا رہے تھے۔ کیونکہ اس کی ماں نے اس سے آٹھ آنے چھینے تھے جو کہ کابلی والا اسے واپس دے گیا تھا۔

"تم نے یہ آٹھ آنے کہاں سے لئے؟

کابلی والے نے مجھے دیئے۔ منی نے کہا۔

"کابلی والے نے تجھے دیئے۔ اسکی ماں غصے میں بولی۔

"او منی تم نے یہ پیسے اس سے کیسے لئے؟

میں نے اسی وقت کمرہ میں داخل ہو کر منی کو مار پڑنے سے بچا لیا اور اپنی تحقیق جاری کر دی۔

یہ پہلا یا دوسرا موقع نہیں تھا۔ میں نے دیکھا۔ کہ دونو اکثر ملتے ہیں۔ کابلی والے نے بادام اور چھوہاروں کی رشوت دیکر منی کے خوف کو دور کر دیا تھا۔ اب دونو گہرے دوست تھے۔

دونوں آپس میں عجیب و غریب مذاق کرتے تھے۔ جو کہ ان کی مسرت کا باعث ہوتا تھا۔ منی کابلی والے کے مضبوط جسم کو دیکھ کر قہقہہ مارتی اور کہتی:۔

" او کابلی والے۔ کابلی والے۔ تمہارے صندوقچے میں کیا ہے؟

اور وہ اپنے پہاڑی لب و لہجہ میں کہتا۔ ایک ہاتھی۔

دونوں ہنس پڑتے تھے۔ ایسی باتیں انہیں بہت مسرور کرتی تھیں۔ تب کابلی والا بھی اس سے سوال کیا کرتا تھا۔

چھوٹی سی مُنی بنا سُسر کے گھر کب جائیگی۔

اَب تو چھوٹی بنگالی لڑکیاں سُسر کے متعلق سب کچھ جانتی ہیں لیکن ہم نے اپنے بچے کو بچپن ہی سے ایسی باتیں نہیں سکھائی تھیں اس لئے مُنی حیران ہوگئی۔ اور بیساختہ اُس کے مُنہ سے نکل گیا

کیا تم وہاں جا رہے ہو؟

کابلی والے کے درجہ کے لوگوں میں سُسر کے دو معنی ہیں۔ وہ جیل کو بھی اسی نام سے پکارتے ہیں۔ اس لئے کابلی والے نے سر ہلاتے اور دانتوں کو پیستے ہوئے کہا۔

میں سُسر کا سر توڑ دونگا ۔!

یہ سنتے ہی مُنی قہقہے مارنے لگتی۔ اور بعد میں اس کا دوست کابلی والا بھی قہقہے مارنے لگتا۔

کابلی والے کی موجودگی میں میری آنکھوں کے سامنے بلند چوٹیوں والے پہاڑوں کا منظر کھنچ جاتا تھا۔ پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانیں ــــــ سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے درے ــــــ پہاڑوں سے میدانوں کی طرف جاتی ہوئی اونٹوں کی قطاریں۔ اور پگڑی پوش مسلح تاجر ــــــ ہر چند میرے تصور کے سامنے گھومنے لگتی تھی۔ اِس کے علاوہ مُنی کی ماں نے مجھے اکثر کہا تھا۔

اِس شخص سے ہوشیار رہنا۔

مُنی کی ماں بدقسمتی سے بڑی بزدل واقع ہوئی ہے۔ وہ جب

کبھی گلی میں شور سنتی ہے - یا لوگوں کو اپنے مکان کی طرف آتے دیکھتی ہے وہ ہمیشہ یہی نتیجہ نکال لیتی ہے۔ کہ وہ چور۔ شرابی، سانپ چیتے، یا انگلش جہازران ہیں۔ باوجود تجربہ وقت کے وہ اپنے خطرے کو دُور نہیں کر سکی۔ اس لئے اُسے کابلی والا پر شک تھا۔ اور مجھے اِس پر نظر رکھنے کی تلقین کیا کرتی تھی۔

میں قہقہہ مارتے ہوئے اس خطرے کو دُور کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتی تھی۔

کیا بچے کبھی اغوا نہیں ہوئے؟

کیا کابل میں غلامی نہیں؟

کیا یہ ممکن نہیں۔ کہ ایک مضبوط انسان چھوٹے سے بچے کو اُٹھا کر لے جائے۔ اس کے سوالات معقول تھے۔ لیکن میں نے اس شخص کو گھر پر آنے سے نہ روکا۔ اور یہ دوستی روز بروز پروان چڑھتی گئی۔

سال میں ایک دفعہ جنوری کے درمیان میں رحیمان کابلی والے کی عادت تھی۔ کہ وہ واپس اپنے ملک میں جاتا تھا۔ اس لئے جونہی وہ وقت قریب آتا۔ تو وہ گھر گھر سے اپنا اُدھار فراہم کرتا تھا۔ اس سال وہ منی کو ہر وقت مل سکتا تھا۔ جسے دیکھ کر کسی دوسرے شخص کو یہی گمان ہوتا تھا۔ کہ ان دونوں کے درمیان کوئی خاص سازش پوشیدہ ہے۔ کیونکہ جب وہ صبح کو نہ آتا۔ تو شام کو ضرور آتا تھا۔

اور میں بھی یہ دیکھ کر چوکنا ہو جاتا تھا۔ جبکہ کمرے کی تاریکی میں کابلی والا رونما ہوتا۔ اور منی کابلی والا ———— کابلی والا پکارتے ہوئے اس کی طرف بھاگتی تھی اور فوراً ہی بعد دونو ہنسنے لگ جاتے تھے۔

ایک صبح کابلی والے کے واپس جانے سے چند دن پیشتر میں کمرے میں بیٹھا ہوا محو مطالعہ تھا۔ موسم سرد تھا۔ کھڑکی سے سورج کی کرنیں میرے پاؤں پر گر رہی تھیں۔ اور حقیقتاً ہی حرارت پہنچا رہی تھیں، اس وقت تقریباً آٹھ بجے کا وقت تھا۔ اور سڑک پر چلنے والے اپنے سروں کو ڈھانپے ہوئے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ یکایک میں نے گلی میں شور سنا۔ باہر گردن نکال کر دیکھا۔ تو کابلی والا دو پولیس سپاہیوں کے درمیان آرہا تھا۔ اور اس کے پیچھے لڑکوں کا ہجوم تھا۔ کابلی والے کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ اور ایک سپاہی چاقو اٹھائے ہوئے تھا۔ میں جلدی سے باہر نکلا۔ اور پوچھا کیا معاملہ ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک شخص نے رام پوری شال کا سودا کیا۔ لیکن بعد ازاں اس نے خریدنے سے انکار کر دیا۔ اور اسی جھگڑے کے دوران میں رحمان نے اسے زخمی کر دیا ہے۔ اور اب اپنے غصے کی حرارت میں مجرم اپنے دشمن کو مختلف برے ناموں سے پکار رہا تھا۔ یکایک میری بچی منی اس کی آواز سن کر میرے مکان کے برآمدے میں آئی اور کہنے لگی۔

"اد کابلی والا" کابلی والا"

جونہی رحیمان نے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ آج اس کے ساتھ ہاتھی کے متعلق گفتگو نہ کر سکی۔ لیکن اس نے دوسرا سوال کر دیا "کیا سسر کے گھر جا رہے ہو؟"

ہاں چھوٹی منی رحیمان نے کہا۔ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ خاموش نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہاتھوں کو اوپر اٹھایا۔ اور کہنے لگا۔

میں نے اس بوڑھے سسر کا سر توڑ دیا ہوتا۔ لیکن میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

رحیمان قاتلانہ حملہ کے جرم میں چند سال کے لئے قید کر دیا گیا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ اور وہ منی کے دل سے فراموش ہوتا گیا۔ اب منی اپنے نئے ساتھیوں میں اپنے لئے دلچسپی تلاش کرنے لگی۔ جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی۔ اس نے اپنا زیادہ وقت لڑکیوں میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا۔

کئی سال گزر گئے تھے۔ یہ موسم خزاں کا مہینہ تھا۔ اور ہم منی کی شادی کا انتظام کر رہے تھے۔ جو کہ پوجا کی چھٹیوں میں ہونی تھی۔ صبح منور تھی۔ بارش کے بعد ہوا میں نمی موجود تھی۔ اور سورج کی کرنیں اصلی سونے کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔

علی الصبح ہی میرے گھر کے دروازے پر شادی کی شہنائیاں بج

رہی تھیں۔ اور ان کی آواز میرے دل پہ جدائی کی ضرب لگا رہی تھی۔ کیونکہ آج رات کو منی کا بیاہ تھا۔

صبح ہی سے مکان میں شور و شغل گونج رہا تھا۔ میرے مکان کے برآمدے میں تنبو تنا ہوا تھا۔ جو کہ درمیان میں ایک بانس کا سہارا لئے ہوئے تھا۔ اور میں کمرے میں بیٹھا ہوا تحو مطالعہ تھا باہر تنبو کے گرداگرد لوگوں کی ریل پیل دکھائی دے رہی تھی۔ اتنے میں ایک شخص کمرے میں آیا۔ یہ کابلی والا تھا رحیمان ——— کابلی والا ——— پہلے تو میں پہچان نہ سکا۔ کیونکہ نہ تو اس کی پشت پر صندوقچہ تھا۔ اور اب تو اس کا مضبوط جسم بھی ڈھل چکا تھا۔ لیکن جب وہ مسکرایا۔ تو میں اسے پہچاننے میں کامیاب ہوا۔

تم کب آئے رحیمان! میں نے اس سے پوچھا۔

"گذشتہ رات" اس نے کہا۔ مجھے جیل سے رہا کیا گیا تھا"

آج یہاں رسومات ادا کی جا رہی ہیں" میں نے کہا۔ اور میں مصروف ہوں۔ یہاں پر کسی دن آ سکتے ہو؟

فوراً ہی وہ جانے کے لئے مڑا۔ لیکن جونہی وہ دروازے کے قریب پہنچا۔ وہ ہچکچایا اور بولا۔

کیا میں ایک لمحہ کے لئے منی کو نہیں دیکھ سکتا جناب اس کا خیال تھا۔ کہ منی ابھی بچی ہی ہو گی۔ اس کی آنکھوں کے

سامنے وہ نقشہ کھنچ گیا۔ جبکہ منی، کابلی والا ——— کابلی والا کرتے ہوئے اس کی طرف بھاگتی تھی۔ اس کا خیال تھا۔ کہ وہ اسی طرح آپس میں ہنسی مذاق کریں گے۔ جس طرح کبھی کیا کرتے تھے۔ حقیقتاً اس نے ان گذرے ہوئے دنوں کے تصور کے زیر اثر یہاں آنے کی جرأت نہ کی تھی۔ اور پہلے کی طرح انگور، اخروٹ اور کشمش نہ لایا تھا۔ جبکہ اس نے اپنی جیب کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے ملک کے کسی شخص سے خریدے تھے۔

میں نے دوبارہ کہا۔

آج گھر میں رسم ہے۔ اس لئے تم آج کسی سے بھی نہیں مل سکتے اس کا چہرہ اتر گیا۔ اور اس نے ایک لمحہ کے لئے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

"صبح بخیر"

مجھے اس کے چلے جانے پر بہت افسوس ہوا۔ اور چاہا۔ کہ اسے واپس بلالوں۔ لیکن وہ خود ہی واپس آگیا۔ اور کہنے لگا:۔

"جناب میں یہ چند چیزیں چھوٹی سی منی کے لئے لایا تھا۔ یہ آپ اسے دے دیں۔"

میں نے انہیں لے لیا۔ اور اسے پیسے دینے لگا تھا۔ کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا۔

"آپ بڑے مہربان ہیں جناب۔ مجھے دولت پیش نہ کریں ——— آپ

کے پاس ایک چھوٹی سی لڑکی ہے۔ اور یقین ہی ایسی ایک لڑکی
میرے گھر میں موجود ہے۔ مجھے اُس کا خیال ہے۔ اور تمہارے بچے
کے لئے پھل لاتا ہوں ——— اپنے لئے نفع پیدا کرنے
کے لئے نہیں۔"

اتنا کہنے کے بعد اُس نے اپنے بڑے لبادے سے کاغذ کا ایک
ٹکڑا رکھ دیا۔ اور اُسے دونوں ہاتھوں سے کھولا۔ یہ ڈرائینگ نہ تھی
اور نہ ہی فوٹوگرافی۔ جبکہ کاغذ پر ایک چھوٹے سے ہاتھ کا سیاہی
کا نشان تھا۔ اور یہی نشان اُسے اس قابل بناتا تھا۔ کہ وہ کلکتہ کی
گلیوں میں اپنا سودا بیچ سکے۔ میری آنکھوں سے آنسو آگئے میں
یہ بھول گیا۔ کہ وہ غریب کابلی پھل بیچنے والا ہے جبکہ میں ——— لیکن
نہیں، میں اُس سے زیادہ کیا بنا سکتا تھا۔ وہ بھی میری طرح
باپ تھا۔ اس کی پہاڑوں میں رہنے والی چھوٹی سی "پاربتی" کے
ہاتھ کے نشان نے مجھے منی کی یاد دلا دی۔

میں نے فوراً ہی اندر سے منی کو بلوا بھیجا۔ بہت سی مشکلات حائل
ہوئیں۔ لیکن میں نے پرواہ نہ کی۔ منی شادی کے لال سلک کے
کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ماتھے پر صندل کا تشقہ چمک رہا
تھا۔ وہ ایک جوان دلہن کی طرح آئی۔ اور میرے پاس پرحجاب کھڑی
ہوگئی۔ کابلی والے نے اُسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گذرے
ہوئے دنوں کا نقشہ کھچ گیا اور ہنستے ہوئے بولا ———

"چھوٹی سی منی کیا تم اپنے سسر کے گھر جا رہی ہو؟"
لیکن اب منی لفظ کے معنی سمجھتی تھی۔ اس لئے وہ خاموش رہی اور نئی نویلی دلہن کی طرح سر نگوں کھڑی رہی، اسکے بعد وہ چلی گئی۔ اور رحیمان نے ایک سرد آہ بھری، اور فرش پر بیٹھ گیا۔ اُسے خیال آیا کہ اُسکی لڑکی بھی اس لڑکی کیطرح اب جوان ہو گی، اور اسے اسکو ایک نئے دوست سے آشنائی کروانی ہے آہ ـــــ معلوم نہیں، ان آٹھ سالوں میں اُس کے ساتھ کیا بیتی؟

شادی کی شہنائیاں گونج رہی تھیں۔ اور سورج اپنی کرنیں اِدھر اُدھر پھینک رہا تھا، لیکن رحیمان کلکتہ کی ایک گلی میں خاموش بیٹھا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں کے سامنے افغانستان کے بنجر پہاڑ گھوم رہے تھے، میں نے اُسے ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا:-

رحیمان اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔ اور اپنی بچی سے ملو ممکن ہے یہ کار ثواب میری بچی کی مسرتوں میں اضافہ کرے۔

اُسکے بعد میں چند ضروری کاموں میں لگ گیا۔ کیونکہ میں نے سوچا ہوا تھا۔ کہ بجلی کے بلب، جلائے جائینگے۔ اور ملٹری کا بینڈ بھی منگواؤنگا۔ لیکن گھر کی عورتوں کو میرے اس پروگرام سے محروم ہونا پڑا کیونکہ اس شادی سے زیادہ مجھے جس چیز کی مسرت تھی وہ یہ تھی کہ ایک مدت کا کھویا ہوا باپ دور کسی ملک میں جا کر اپنے اکیلے بچے سے ملیگا۔

انارکلی

انارکلی کون تھی؟

انارکلی، ہندوستان کے شہنشاہ اکبر کے شاہی محلات کی ایک باندی زادی حسینہ جو انارکلی کے نام سے مشہور ہوئی۔

ایک مرتبہ وہ باغیچہ میں کھڑی تھی شہنشاہ اکبر وہاں آئے۔ اور انہوں نے ہنسی مذاق میں اس کو انارکلی کے نام سے پکارا۔ بس تب سے نادرہ کا نام انارکلی پڑ گیا۔ وہ بلا کی خوبصورت تھی۔

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تیری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

انارکلی کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ وہ کھلتی ہوئی کلی ہے۔ یہ معلوم

معشوقہ انارکلی نہایت حسین پیاری پیاری لڑکی تھی۔ جس کا جسم انار کے پھول کی طرح خوبصورت اور نازک تھا۔ شاہی بیگمات بھی انارکلی کے حسن پر جی جان سے شیدا تھیں۔ جب یہ پیاری پیاری حسین چڑیا انارکلی شاہی محلات کی چاردیواری کے محدود سے میدان میں ہنستی، مسکراتی، کھیلتی، دوڑتی گویا ہرن کے پیارے پیارے بچے کی طرح اٹھکھیلیاں کرتی۔ اور خرام کبک رفتار کی طرح اپنی مستانہ چال سے دلوں کو لبھاتی ہوئی پھرتی تھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ حسن معصوم کی دلکش جھلک عشق کے سرسبز میدانوں میں چوکڑیاں بھرتی ہوئی۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر اپنی نازک خرامی میں مصروف کار ہے۔ گویا جس طرح پھولوں کی خوب کھلی کنج میں نغمہ خاموش گاتی ہوئی اڑنے والی ہے۔ خوش خرم اور رسیلی پیاری سی تیتری

حسن معصوم کی یہ پیاری پیاری جھلک۔ انارکلی کس طرح ناشگفتہ رہ سکتی تھی۔ اس کلی کی مانند وہ کھل اٹھی۔ جس کو کہ آفتاب کی پرنور اور سنہری شعاعوں نے اس کی خوبصورتی میں جوش اور اٹھتا ہوا طوفان برپا کر دیا ہو گویا آمد شباب نے انارکلی کے اٹھلاتے ہوئے جوبن کو چار چاند لگا دیئے۔ جس سے معصوم حسن کامل بن گیا۔ پھول تو

پہلے ہی کیا کم تھے۔ اب تو اور ستم ڈھانے لگے

گویا انارکلی پر شباب کا امڈتا ہوا سیلاب سا آگیا۔ وہ معصوم حسینہ

سے نوجوان نازنین میں تبدیل ہو گئی۔

شباب کے اس قیامت خیز طوفان نے حسن میں ایک طلاطم سا بپا کر دیا تھا۔ نور کے جلوؤں میں تڑپتی کاریوں نے آہنائے حسین میں اس طرح کا مد و جزر پیدا کر دیا تھا۔ کہ توبہ توبہ۔ انارکلی حسن معصوم کے کمسن پودے کی طرح معصوم سی کلی سے نوجوان پودے کی شباب آور کلی۔ اور چٹک سے غنچے کی نمایاں کلی میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ اسے لڑکپن کی کھیل کود ماضی کی یاد بنکر رہ گئی تھی۔ معصوم کلی کی مسکراہٹ میں ایک حیرت انگیز جادو تھا۔ ایک لاانتہا ہی سحر تھا۔ جو سب پر قابو پالیتا اس کی سیاہ سی آنکھوں میں کالے جادو کی بے خطا کشش تھی۔ وہ لاکھوں خوبصورتیوں سے بڑھ چڑھ کر دلپذیر تھی۔ لیکن اب تو سحر سامری اور سلیمانی جادو نے جوانی کے جوش میں ایک اٹھتا ہوا طلسم سا بھر دیا تھا۔ انارکلی آرام سے ایک ثانیہ کا قلیل سا وقفہ بھی نہ گزار سکتی تھی۔ ہر لمحہ وہ نئی ادا کا سوانگ بھرنے والی مجسمہ سا بن جاتی۔

شاہی محل میں رہنے والی تمام حسین و جمیل عورتیں حتیٰ کہ کنیزیں بھی انارکلی کو دیکھ کر سرد آہ بھرتیں۔ کیونکہ اسے دیکھ کر ان کو اپنی جوانی کی گذری ہوئی کہانیاں پھر سے یاد آجاتیں جب انارکلی کی ہم عمر معشوقہ تیں اسے چھیڑ چھاڑ کر کہتیں "آہا اب تو کلی کھلنے لگی ہے" تو تب انارکلی ایک خاص طرز کے ناز و عشوہ سے اداولہ بائی سے اپنے یاقوتی لبوں پر

مٹھاس کی شوخ سی مسکراہٹ لاکر کہہ اٹھتی "کیوں نہ کھلے گی" غرضیکہ معصوم انارکلی نوجوان انارکلی میں تبدیل ہو گئی۔

شاہی محل میں کسی قسم کا پردہ نہ تھا۔ انارکلی کے حسن پر سب سے پیشتر جس کی عشقیہ آنکھ پڑی وہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ بلکہ شہنشاہ وقت کا فرزند ارجمند ولی عہد سلطنت شہزادہ جہانگیر تھا۔

"انارکلی تو میری ہے۔ اور صرف میری ہے"

اداؤں کی پتلی انارکلی بذات خود ان دلکش اداؤں کا مجسمہ تھی۔ اور کہ اسے ایک دفعہ دیکھ لینے سے ہی دل مارے محبت کے مضطرب سا ہو اٹھتا تھا۔ اسکے حسن دلکش نے شہزادہ سلیم (جہانگیر) کو اپنے عشقیہ جنگل میں پھانس لیا تھا۔ اور جہانگیر کسی ایسے مناسب موقع کا منتظر تھا۔ کہ وہ اس سے اپنے دل دیوانہ کی یہ بات صاف طور سے کہہ دے۔

"انارکلی مجھے تم سے عشق ہے"

ایک روز بہار کی شام تھی۔ بارش نے بند ہو کر سب چمن کو کھلا دیا تھا۔ باغ کی کیاریاں، پودے اور سب کچھ بارش کے پانی سے غسل کر کے صاف شفاف سے ہو گئے تھے۔ موتیا کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو باد نسیم سے ہم آغوش ہو کر ایک عجیب سا لطف پیدا کر رہی تھی، پتوں سے بارش کے پانی کی ٹپ ٹپ کرتی بوندیں ایک عجیب طرح نغمہ سرا تھیں۔ بارش کے پانی سے آسمان نے بھی

غسل لیا تھا۔ اور اب چاندنی چاند کی درختوں کے گھنے گھنے پتوں سے
چھن چھن کر گزر رہی تھی۔

بہارستان کی اس عجیب و غریب شب ماہ میں انارکلی سنگ مرمر کے فرش پر چہل قدمی کرتی ہوئی اپنے آرا کی تلاش میں سرگرم عمل تھی
آرا کون تھا؟ اس کا پالتو غزال، ننھا سا ہرن۔

"آرا، آرا، آرا"

اسکی مٹھاس بھری سریلی آواز کی پکار کے جواب میں سونے کے گھونگھروؤں کی چھنچھناتی ہوئی ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"آرا۔ آرا"

انارکلی کی آواز پھر گونج اٹھی۔ اور اس کے ساتھ ہی چھن چھن کی آواز اس طرح سے سنائی پڑتی تھی۔ کبھی دور سے کبھی نزدیک سے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہرنی کے بچے نے اسکی آواز سن لی ہے ورنہ وہ اسکی آواز کا جواب کیونکر دے رہا تھا۔ مگر وہ کہاں تھا۔ اگر وہ کہیں آزاد ہوتا تو آرا، آرا کی پہلی صدا میں ہی تیز دم چوکڑیاں بھرتا ہوا نہایت خوشی سے انارکلی کے نازک نازک اور پیارے ہاتھوں میں پہنچ جاتا۔ انارکلی نے پھر پکار لگائی۔ پھر وہ جھانجن کی جھنکار سنائی دی۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ اور وہ آواز کے جھولے پر ہولی جس طرف سے کہ جھنکار آرہی تھی۔ اب انارکلی شاہی باغیچہ کے ایک غیر آباد سے

گوشہ میں پہنچ گئی۔

نازک اور پیاری انارکلی۔ بارِ نزاکت کا بوجھ نہ اُٹھا سکی۔ اس نے تھکی ہوئی تکلیف دہ آواز میں محبت کی ایک خواہش پیدا کر کے پھر پکار لگائی۔

"آرا۔ آرا۔ کہاں ہے تو بدبخت!؟"

اس اثنا میں وہ غزالی بچہ ایک درخت کی آڑ سے چوکڑیاں بھرتا ہوا نمودار ہوا۔ اور انارکلی کے محبت بھرے ہاتھوں کی معصوم سی گرفت میں پہنچ گیا۔

بہارستان کی پُرشباب شب وہ وقت اپنی خاموشی کو غزالی۔ بچے کے اگلے تیز پاؤں میں پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھنگھروؤں کی جھنکار کو اور بھی دلچسپ سا بنا دیا تھا۔ انارکلی نے عالم خود فراموشی سے غزالی بچے کو چوم چوم کر پکارا اور پیار کرتے ہوئے بولی۔

"آرا۔ آرا"

اور اس کے بعد محبت کے معصوم جوش میں اپنی گوری گوری باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ اور اس کو کھینچ کر منہ سے لگا لیا۔ پھر کھینچ کر ایک میٹھا سا بوسہ دینے کے بعد بولی۔

"ارے تو اب تک کہاں تھا۔ تجھے کس نے پکڑ رکھا تھا۔"

"میں نے"

ایک آواز آئی۔ انارکلی نے خوفزدہ آنکھوں سے اس طرف دیکھا

ایک نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ بولا "میں نے تمہارے ہرن کو پکڑ رکھا تھا۔"

انارکلی شرم سے دوچار ہوگئی۔ اس کے عارض گلفام حیا کی سرخی سے سرخ ہوگئے۔ اس نے چہرے پر نقاب کھینچ لی۔ اور نوجوان کو مؤدبانہ طور سے سلام کر کے بولی۔

"معاف فرمائیے حضور مجھے معلوم نہ تھا کہ ......"

اسکے بعد اس کی آواز میں کانپتی ہوئی خاموشی سی پیدا ہوگئی۔

"نہیں نہیں انارکلی۔ چاہیئے۔ تو مجھے کہ تم سے معافی مانگوں" نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر ذرا قریب آکر بولا۔

"پیاری انار۔ تم جانتی ہو کہ میں نے تمہارے ہرن کو کس لئے روک رکھا تھا۔ صرف اس لئے کہ اس کی چشم غزالی تمہاری آنکھوں جیسی ہیں۔"

انارکلی تصویر خاموش بنی سب کچھ سنتی رہی۔ اسکے کانوں نے اس سے پیشتر بھی سن رکھا تھا۔ کہ شہزادہ سلیم اس پر جی جان سے شیدا ہے۔ لیکن اب تو شہزادے اسے اپنے لبوں سے اقرار عشق سنکر اس کے دل کا شک وشبہ کافور کی طرح اڑ گیا۔

انارکلی کے دل پر ایک قدرتی خوشی برسات کے بادلوں کیطرح چھائی ہوئی تھی۔ وہ خاموش سی کھڑی تھی۔ اور شہزادہ سلیم اسکے قریب ہی محبت کی للچائی ہوئی مست آنکھوں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسکی آنکھیں کہہ رہی ہوں۔

انارکلی تم اپنے کو ان آنکھوں میں دیکھو پھر سمجھو کہ تم کون ہو۔ میں کون ہوں۔ اور حسن و عشق کس چیز کا نام ہے۔

انارکلی شرمائی ہوئی پری کی طرح نیچی نظریں کرکے مسکرائی۔ اور پھر تیر محبت چھوڑتی ہوئی آنکھوں سے سلیم کیطرف دیکھا۔

سلیم نے اپنے بامحبت بازو اسکی صراحی دار گردن میں ڈال دیئے۔ اور اس کو سینے سے لگا کر جوش محبت سے بولا۔

"انارکلی۔ تو میری ہے۔ اور صرف میری ہے۔"

"انارکلی کچھ لڑکھڑائی۔ سلیم کے بازو اس کے گلے میں محبت کی مالا سی بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک طرف کو کھسک گئی۔

آرا۔ آرا۔ چونک پڑا۔ جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا ہو۔

انارکلی نے آرا کی طرف دیکھا۔ اس کی غزالی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو قطروں کا تار ٹپکے ہوئے موتیوں کی طرح چاند کی نورانی کرنوں کے ٹھنڈے اجالے میں نظر پڑا۔

کیا انارکلی درا صل بہت حسین تھی؟

یہی ایک سوال تھا۔ جو اس کے اپنے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ پھر دنیا کے دل میں کیوں پیدا نہ ہوتا۔ تمام شب وہ جاگتی رہی سو نہ سکی۔ اس کا بخت چمک اٹھا تھا۔ گذشتہ شام کے واقعے نے اس کی نیند حرام کر دی شہزادہ سلیم کے اس عجیب غریب اچانک

موقعہ کے آزاد عشقیہ اظہار نے ایک قابل ذکر مسرت کی اٹھتی ہوئی مدوجزر اس کے بحر جسم میں موجزن کر دی تھی۔
انار کلی ایک بحر تخیل میں غوطہ زن تھی۔ اس کا دل حیرت آمیز مسرت کے نہ مٹنے والے خوابوں پر تھا۔ اس کی مستانی آنکھیں معصوم سی کلی طرح بند تھیں۔ لیکن وہ بیدار تھی۔ اس وقت اس کے خانہ دماغ میں محض گذشتہ خیالات کے واقعات خواب کی طرح اُبھر رہے تھے۔ وہ گزری ہوئی با محبت شام کے ہر ایک چھوٹے چھوٹے واقعہ پر از سر نو غور کرنے میں مشغول تھی۔
سلیم نے اسے یوں پکارا تھا۔
"انار کلی تم میری ہو۔ اور صرف میری ہو"
آہ شہزادہ کی زبان میں کس قدر مٹھاس بھری تھی۔ اور انار کلی نے اپنے چاند سے چہرے اور شرم کی سرخی کو کس طرح سے دور کرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ کہ وہ کس طرح سلیم سے بغلگیر ہوئی۔ اور کس محبت سے کپکپی میں لڑکھڑاتی ہوئی اس کی آغوش الفت سے کھسک کر ایک طرف ہو گئی۔ کس طرح دونوں کی آنکھوں نے محبت کے اشارے پھینکے تھے۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی کتنی خواہش بھری تھی۔ اور اس کی آنکھیں کس طرح کی ناچیز ترین قلیل سے عرصہ کی انکساری، عاجزی اور اس کے ساتھ ہی طلب معافی کی معصوم سی درخواست کا اظہار ہوتا تھا۔ جس نے انار کلی کو از خود

وارفتہ سا بنا دیا تھا۔

اُف۔ اس کے بعد کیا ہوا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ وہ پُرلطف گھڑی بھی بہتے ہوئے پانی کی طرح گزر گئی۔ جب محبت کے دو طرف لب ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ تب کیا ہوا تھا۔ یہ ہوا تھا تب دونوں کے رخسار ایک دوسرے کو گلاب کی معصوم سی پیاری پیاری پنکھڑیوں کی طرح محسوس ہوتے تھے۔

اس کے دل میں پوشیدہ سا خیال اُٹھا۔ اور اس نے بار بار محسوس کیا کہ اس کا دل دھک دھک کر رہا ہے لیکن اس کے فوراً ہی بعد انارکلی کو اپنے مسرت کامیابی اور سرکار حسن کی فتح کا خیال آجاتا تھا۔

یہی وہ خیالات تھے۔ جنہوں نے اس کے دماغ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ تب انارکلی سوچ کس طرح سکتی تھی سے

بیمار محبت کو کب آتی ہے نیند کروٹیں لیتے ہی لیتے صاف اُڑ جاتی ہے نیند

محبت عشق صرف یہی ہے۔

شہزادے نے اس سے اقرار عشق کیا۔ کس قدر حیرت کا مقام تھا۔ یہ وہ اچھی طرح سے نہ سمجھ سکی۔ کہ یہ واقع کس طرح ہوا۔

کیا وہ درحقیقت خوبصورت تھی۔ اور نہایت حسین؟

ہاں۔ اسے خود اس بات کا یقین ساہو چکا تھا کہ وہ دنیا کی

خاص حسینہ ہے۔ پس اس پُر مسرت خیال نے اس حسین باندھی کو گرویدہ بنا دیا تھا۔ سلیم کا جس نے اسے حسینہ کہا تھا۔

محبت اور عیش کی زندگی بسر کرنا کس قدر دلچسپ خیال ہے ایک لمحہ کے لئے مستقبل کی سیر بہار زندگی کا منظر اس کی آنکھوں میں کھینچ گیا۔

شہزادہ سلیم اسے اپنے من کی ملکہ بنائیگا۔ اور محبت کا یہ حسین جادو دونوں کو وادی عشرت کی طرف لے جائیگا۔

آہا۔ مبارک گھڑی۔ آجلد آ۔ برائے خدا جلد آ۔

اس طرح کشش عشق میں انارکلی بحر تخیل میں غوطہ زن تھی۔ عیش و عشرت سے آرام دہ جھرنے سے خوشی کا بہتا۔ اچھلتا سیلاب اُمڈ آیا۔ اور اس نے انارکلی کے جسم کو تہ آب کر دیا۔

ہر لمحہ اس کے لئے ایک محبت کی پہیلی تھا۔ جسے حل کرنیکی کوشش کرتی لیکن کھوئے لئے کھوئے خود پہیلی بن جاتی۔

کشتۂ الفت شہزادہ سلیم نے بھی انارکلی کیطرح رات گزاردی اس کا اُٹھتا ہوا عالم شباب تھا۔ ابھی اس نے سن بلوغت میں قدم رکھا ہی تھا۔ مگر اس سے بڑھ کر اور کون زیادہ محبت کسی سے کر سکتا ہے۔ جس کے دل میں بھولے پن کے ساتھ جوانی کا جوش اور منچلا پن بھی ہو راہ عشق میں گامزن ہونے کے لئے سلیم کا یہ سب سے پہلا کارنامہ تھا۔ وہ صرف انارکلی سے ہی دوچار ہوا تھا۔ اس سے پیشتر اس کا

دل کسی اور پر نہیں آیا تھا۔

سلیم ۔ بیتاب سلیم کے دل پر تصور تھا۔

انار کلی ——— اس کی غزالی آنکھوں کا ——— اسکی میٹھی میٹھی باتوں کا ——— اسکے حسین عالم منور چہرہ کا اور سرخ سرخ رخسار پر پرشرم دنیا کی اٹھتی ہوئی لہروں کا

رات کو وہ کب آیا۔ یہ اسے معلوم نہ ہوا۔ اور ہوتا بھی کیسے وہ خود فراموش ہوتے ہیں عشق کمانے والے۔

چند روز کے بعد ———

شاہی محل کے آراستہ و پیراستہ دربار میں عیش و طرب کا ایک خاص جلسہ منعقد ہوا۔ شہنشاہ اکبر کو علم موسیقی کا خاص شوق تھا۔ اور ہر شام کو اپنے کانوں سے نغموں کی دنیا آباد کرنا اس کا معمول تھا۔

ناچنے گانے میں انار کلی بے حد ماہر تھی یہی باعث تھا کہ وہ شہنشاہ اکبر کی آنکھوں میں چمک سی بن کر رہ گئی تھی۔ گانے بجانے کا کوئی جلسہ بھی اسکی عدم موجودگی سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچتا تھا۔

شہنشاہ اکبر اپنا بہت سا وقت شاہی بیگمات کے ساتھ سیر کرنے میں گزارتا تھا۔ ہر روز انار کلی کو اس کے سامنے اپنے فن نازک کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔

آج جبکہ اکبر کا شیش محل چمکتی ہوئی رنگ برنگ کا نوری شمعوں سے چودھویں کا چاند سا بنا ہوا تھا۔ کمخواب کے فرش پر دو بیگمات کو اپنے

ساتھ ساتھ مسند شاہی پر بیٹھے ہوئے حسن و عشق کی پرسرار وادی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور کئی ایک نازنین کنیزوں کے حلقہ باندھے ناچ گانے نے ایک اور ہی دلکش سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اسکی آنکھیں انارکلی کو تلاش کرنے میں مشغول تھیں۔

انارکلی ایک تکیہ کی آڑ سے نکلی۔ اس نے شہنشاہ اکبر کو نہایت حسین ادا سے سلام کیا۔ اکبر نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ حسین پری بنی کھڑی تھی۔ آج اس نے ہلکے سے گلابی رنگ کا جامہ زیب کیا تھا۔ اس نے بال بال موتی پروئے ہوئے تھے۔ اسکی صراحی دار گردن اور اُٹھتے ہوئے سینہ پر موتیوں کے لٹکتے ہوئے بیش قیمت ہار...... دل کی دھڑکن کے ساتھ ساتھ دھک دھک کر رہے تھے آج تک کسی نے اس کو اس طرح کی حسین ترین اور کرشمش میں ڈوبا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ بیشک اسکو خوبصورتی کے لئے کس طرح کے زیوروں کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن پھر بھی سونے پر سہاگا لگایا گیا تھا۔ جس نے اس کی خوبصورتی کی آگ کو اور زیادہ روشن کر دیا تھا۔

اکبر نے ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر بولا۔

"ماہ منیر (چودھویں کے چاند) کو چھوٹے چھوٹے چمکدار تاروں پر فتح حاصل کرنے کیلئے ہار کی ضرورت نہیں پڑتی تو پھر اے خوبصورت لڑکی یہ زرق برق لباس کس لئے؟"

انارکلی کی زبان پر ایک شرم کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ ان سب باتوں کو جو کہ اسکے دل میں پنہاں تھیں کس طرح سے آشکارا کر سکتی تھی۔ چونکہ جلسہ میں سلیم موجود تھا۔ وہ کیوں نہ عمدہ جامہ زیب تن کر کے آتی۔

ستار کی مستانی سی تن تنا تن نے محل میں سماباندھ رکھا تھا۔ انارکلی کھڑی کھڑی سُن رہی تھی۔ اس نے سازندوں کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔

سازندے خاموش ہو گئے ستاریں رکھ دی گئیں۔

انارکلی لہرائی ہوئی آگے بڑھی اس نے اپنے پاؤں کی ٹھکت دی۔ ٹخنوں پر بندھے ہوئے طلائی گھونگھروؤں نے چھم چھم ایک نازک سی لہر فضائے لطیف سے بلند کر دی۔ اس نے پھر پاؤں کو نہایت آہستگی سے اٹھایا۔ اور پھر چھم چھم کی آواز پیدا کی۔

ایک سازندے نے ستار اٹھائی اور بجانے لگا۔

چھن چھن کی جھنکار ستار کی تن تنا تن میں مخلوط ہو گئی۔ انارکلی نے اپنے یاقوتی لب کھولے اور باریک سی موسیقی کی ایک اور راگنی مدھم سی آواز میں گائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ صرف اسکے ہونٹ ہل رہے ہیں آواز پیدا نہیں ہوتی۔

ایک بار پھر آواز پیدا ہوئی۔ اور صاف طور پر بلند ہوئی۔ اس وقت

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ خوش ترین گلو چاند کی رات میں مسرت بنا دینے والا راگ گا رہا ہے۔

اس شام کو گاتے وقت انار کلی کے دل میں ایک شیریں خیال چٹکیاں لے رہا تھا۔ اس کو معلوم ہوتا تھا۔ کہ حقیقت میں وہ کوئی دلچسپ سا خواب دیکھ رہی ہے۔

دراصل یہ صرف محبت ہی تھی۔ جو اسکی رگ رگ میں رچ بس رہی تھی۔

انار کلی نے چاروں طرف دیکھا۔

ایک طرف سلیم کھڑا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اسکی بڑی بڑی آنکھوں سے محبت آشکار تھی خفیہ ملاقاتوں کی یاد انار کلی کے دل میں پھر سے تازہ ہو گئی۔ اسکی آنکھوں سے اسکی زبان سے محبت کا بے پایاں پُر مسرت خیال ظاہر ہونے لگا۔

سلیم کی آنکھوں میں انار کلی کی ناچتی ہوئی تصویر کا تصور اس کے دل میں رہ رہ کر چٹکیاں لیتا تھا۔

کہ انار کلی کی آنکھوں میں کیا جادو بھرا ہے۔

انار کلی گانے لگی۔ لہراتی ہوئی میٹھی ترنم میں، فارسی کا یہ گیت

من تو شدم تو من شدی۔ من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

سلیم کیطرف ٹکٹکی باندھ کر گانے والی انار کلی کا یہ گیت اسکے دل میں کسی چھپے ہوئے جذبے کو ظاہر کر رہا تھا جس کو اس نے

خود کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ بحرِ محبت میں غوطہ زن ہوتے ہوئے اپنے عاشق کے مقابل میں ان راگنیوں کا گانا جن کے خیال اسکے دل میں بسے ہوئے تھے ——— وہ سب کچھ بھول گئی۔ اسکو اس بات کا خیال بھی نہ رہا۔ کہ وہ شہنشاہ اکبر کے روبرو ناچ گا رہی ہے۔

انارکلی کو صرف ایک بات کا علم تھا۔ وہ یہ کہ اسے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ دو انسان موجود ہیں۔

ایک وہ دوسرا اس کا عاشق شہزادہ سلیم

وہ ناچ گا رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں سلیم کی آنکھوں میں بسی ہوئی تھیں۔ اور شہزادے سلیم کی آنکھوں کا اسکی آنکھوں میں جانا گویا آگ پر تیل کا کام دے رہا تھا۔ اس وقت ایک بلند آواز کانوں میں آئی۔

"گانا بند کردو!"

یہ آواز شہنشاہ اکبر کی تھی جو بے حد کرخت تھی۔ وجد پھوٹ گیا طلسم ٹوٹ گیا۔ اور انارکلی کانپ سی گئی۔ گانا بند کرا دیا گیا۔ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

اکبر مارے غصے کے کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں تن گئی تھیں اس نے مقابل میں گاتے ہوئے آئینے کے عکس میں دیکھتا تھا۔ عاشق و معشوق کی آنکھوں کی عشقیہ شعاعوں کو۔ جو لگا تار کافی عرصہ تک ایک دوسرے کی طرف جا رہی تھیں۔

اُسنے آئینے میں دیکھا تھا۔ محبت کا یہ نام و پیام تیز تیز بڑھنے

کیلئے اس نے خود کوشش کی تھی۔

اس نے انارکلی کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ اور اسکے جواب میں شہزادہ سلیم کی مسکراہٹ بھی دیکھی آنکھوں کا لڑنا دیکھا۔

اور اسے یقین سا ہوگیا۔ کہ انارکلی نے شہزادہ سلیم کو پھانسنے کے لئے نیا دام حسن بچھا دیا ہے۔

اکبر کی طبیعت میں اگرچہ خوب تحمل تھا لیکن اس وقت اس کا مزاج درہم برہم سا ہوگیا۔ اسکے دل میں خیال پیدا ہوا۔

"کیا سلیم جو اس کا فرزند اور ولی عہد سلطنت ہے۔ ایک باندی کی لڑکی سے محبت کرے گا؟"

وہ جامہ سے باہر ہوگیا۔ اس نے ایک بلند آواز میں خواجہ سراؤں سے کہا اور انارکلی کیطرف اشارہ کیا۔

"اس عورت کو یہاں سے لے جاؤ۔ اور شاہی محل کی حوالات میں بند کر دو۔ تاکہ ان معمولی سی عورتوں کو کان ہو جائیں۔ جو بلا وجہ بغیر کسی مناسب موقعہ کے اس طرح کا بناؤ سنگار کرتی ہیں!"

ہر طرف سناٹا تھا۔

انارکلی اکبر کے چہرے کیطرف معصوم محبت کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر جب اس نے اکبر کی انگلیوں کو اپنی طرف اُٹھتے دیکھا تو اس کے جسم میں خوف کی لہر سی پھیل گئی۔ اسکے دل میں خیال پیدا ہو شہنشاہ نے اس طرح کا حکم دیا!

انارکلی نے اپنے دل سے دریافت کیا۔ اس نے قہر کی ایک خوفناک آواز سنی۔ اس کا سر جھک گیا۔ اسکی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی جو کچھ بھی اس نے دیکھا وہ اس نے نہ سمجھا۔ بینائی سے دیکھا جاتا ہے سنا نہیں جاتا۔"

اچانک اسے کسی کا ہاتھ اپنے جسم سے لگتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے دیکھا۔ ایک خواجہ سرا۔ اس کو سختی سے تھامے ہوئے تھا۔ جو اسے حوالات میں لے جانے کے لئے آمادہ تھا۔

انارکلی نے خود کو جنبش دی۔ اور پھر تنہا اکبر کے قدموں میں گر پڑی بالکل اسی طرح جیسے ——— موسم خزاں کا ایک مرجھایا ہوا پھول ٹپک پڑا ہو۔

جس طرح چراغ گل ہو جانے سے تاریکی چھا جاتی ہے۔ اور پرندوں کے پھڑپھڑانے کی آواز بھی سکوت سی بن جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح کی سکوت اور تاریکی ہر جانب تھی۔ جب تاریکی اور سکوت دونوں ہم آغوش ہوں تب ایک خوفناک نظارہ پیدا ہوتا ہے ؎

تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
وہ تصویر خیالی ہی رہی ہے روبرو برسوں

شب تاریک کے سکوت میں انارکلی کو ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ اور پھر تخیل میں غوطہ زن ہو گئی۔ اس کو ہر ایک چیز پر تاریکی دکھائی دیتی تھی۔ اچانک اسکے دل میں کونسی

منجمد کر دینے والی خوفناک یاد آئی۔ آہ کس قدر غربت کا مقام تھا۔

انارکلی۔ دنیا کی نازک ترین حسینہ ایک قیدی کی حیثیت میں اجل کے منتظر کی حیثیت سے جیل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں سنگی چٹان پہ پڑی ہوئی تھی۔

موت کے خیال سے اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب سا گیا۔ اس موت کے خیال سے اسکی روح لرز گئی - جو آنیوالی صبح کو ہونیوالی تھی۔ صرف چند گھنٹوں کی زندگی کے بعد اسکی معصوم سی زندگی کا خاتمہ ہو جانے والا تھا۔ انارکلی نے اپنے سامنے کے فرشتہ کو انسانی ڈھانچوں پہ قیامت کا ناچ ناچتے ہوئے دیکھا۔

دنیا کی ہر ایک چیز کا خاتمہ کر دینے والی موت ہر لمحہ اسکے نزدیک تر ہوتی جاتی تھی۔ جسکے خیال سے انارکلی بید مجنوں کیطرح کانپ رہی تھی۔ اسکے ساتھ ہی وہ عالم مایوسی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آہ - بےرحم اور ظالم موت کتنی خوفناک اور ظالم موت۔ انارکلی کیطرف رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ موت کے انتظار میں رہنا۔ اور اس پر موت کے آنے کے وقت کی ہر لمحہ انتظار کرنا خود موت سے بھی کئی گنا زیادہ تکلیف دہ ہے۔

انارکلی بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کا سر جھکا رہا تھا۔ وہ ناہموار فرش پر سر کے بل گر پڑی۔ دل کے رنج والم کی تڑپ اسکے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ مرنے لگی۔ اس جگہ اس کو بچانے والا کوئی نہ تھا۔ اس سے دلی ہمدردی کرنے والا کون تھا؟ وہ بےیار و مددگار تھی۔ سلیم جس کیلئے

اس نے خود کو موت کے منہ میں ڈالا تھا۔ اس وقت کہاں تھا؟
لیکن خوب اسکے دل میں سلیم کا تصور آیا تو اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور پھر خوب روئی۔ زار وقطار مثل ابر نو بہار۔ جب دل کی ہچکیاں لبوں کی سسکیوں کے ساتھ بند ہوئیں تب ہوش میں آکر صبر سے اس نے سوچنا شروع کیا۔ لیکن اسکے دل کا تخیل پھر اس کو بحر آرام کیطرف لے چلا جسکی وجہ سے صبر کی تار ٹوٹ گئی۔ اس نے سوچا وہ کیوں پکڑی گئی۔ اس نے کونسا کام ایسا کیا تھا۔ جو ناجائز تھا جس کی پاداش میں وہ مجرم قرار دی گئی تھی۔

"شہزادے سے محبت کرنا کیا جرم ہے؟"
اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔
"یہ گناہ تو نہیں نہ ہی خلاف قانون بات ہے"
دوسرے لمحہ اس کی آزاد خیالی سے جواب دیا۔
"میں نے کوئی برا کام نہیں کیا" اس کو یقین ہو گیا۔
وہ گانے لگی۔

"میں نے تم سے پریم کیا ہے ـــــ تم نے میرا دل چھین لیا ہے
اب کہاں ہو۔ جان من تم ـــــ جام محبت تو اب پیا ہے
ہو گئی ویرانی میں ـــــ محبت کی کہانی میں ـــــ معصوم جوانی میں
شاہی جیل خانے میں میں نے موت سے پاسا جیت لیا ہے۔ اُف
اُف۔ اے خدا تو نے امید کی دیوی کو کیوں پیدا کیا۔ جبکہ اس کا

پایۂ تکمیل تک پہنچنا ہی مشکل ہے پھر کس لئے آہ کس لئے

ایک بھی چیز وہاں ایسی نہ تھی۔ جو اس کیلئے چنداں تسکین بخش ثابت ہوتی۔ یا اسکے خوف کو دور کرنے میں امداد دیتی۔ اس کا خیال سلیم کی طرف گیا۔ کیا وہ اس کیلئے کچھ نہیں کر سکتا؟ پھر ایک خیال اسکے دل میں آیا۔ کیا درحقیقت شہزادے کو مجھ سے محبت ہے؟ یا یونہی دکھاوے کا عشق ہے۔ جو انسان ہر لمحہ فراموش کر دینے کے لئے کرتا ہے۔ یہ خیال اس کے لئے موت سے بڑھ کر تکلیف دہ تھا۔

"سلیم مجھے دل سے نہیں چاہتا"

اس بے یقینی میں موت کے برابر ناپسندیدہ کرب پنہاں تھا۔ اس وقت کسی کے قدموں کی چاپ نے اس کو چونکا دیا۔ دروازہ کھلا۔

ایک سپاہی ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل لئے ہوئے وہاں آیا اسکے پیچھے ایک اور انسان تھا۔ اس نے کہا۔

"انارکلی۔ جان من"

"سلیم"

اسکے لبوں سے بے ساختہ نکل گیا۔ لیکن ساتھ ہی خوشی کی ایک چیخ جس میں کچھ نہ کچھ درد بھی چھپا ہوا تھا۔

دونوں محبت کی ایک آغوش بن گئے۔

سپاہی نے روشن مشعل ایک گوشے میں رکھدی اور خود باہر نکل گیا

گوشۂ تنہائی میں عاشق و معشوق خوب جی بھر کے گلے ملے پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے روتے انہوں نے ایک دوسرے سے شکوے کیے۔

سلیم نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"پیاری انارکلی، میری اچھی انارکلی۔ میں تمہیں بچا سکتا ہوں میرے ساتھ چلی آؤ۔"

انارکلی نے سلیم کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ سلیم پھر بولا۔

"میں نے سواری کے لیے دو گھوڑوں کا انتظام کر چھوڑا ہے صبح ہوتے ہی ہم کافی فاصلہ طے کر لیں گے۔ پھر بھیس بدل کر چل دیں گے۔ تب کوئی ہمیں پہچان نہ سکے گا۔"

انارکلی نے درد بھری آواز میں جواب دیا۔

"ضروری بات ہے کہ ہمارا تعاقب کیا جائے ہم گرفتار ہو جائینگے لیکن میرے لیے تم اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالتے ہو۔"

"لیکن پیاری انارکلی، میرے ہمراہی میری امداد کیلئے ہر لمحہ سینہ سپر ہیں۔ وہ تعاقب کرنے والوں کو الٹا بتائینگے ہمارے گھوڑوں کے سموں پر بے آواز موزے چڑھے ہوئے ہیں۔ پیاری جلد نکل بھاگ اسوقت ایک ایک ثانیہ بیش بہا گوہر کی طرح ہے چل۔ انارکلی، نکل وقت کو کیوں کھو رہی ہے۔"

لیکن انارکلی ششش و پنج کی جیتی جاگتی تصویر بن گئی۔

"شہزادے کو خطرے میں ڈالنے کا مجھے کیا حق ہے؟"

اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"سلیم اب بے شک میری موت نزدیک ہے۔ اگر خدا اور شہنشاہ کی بھی خواہش ہے تو میں کیسے زندہ رہ سکتی ہوں۔ میں اس تنگ و تاریک کوٹھڑی کو ہرگز نہ چھوڑونگی۔ تاوقتیکہ میری موت مجھے آغوش الفت میں نہ لے لے۔ میرا منہ نہ چوم لے"

سلیم سناٹے میں آگیا۔ چند لمحے توقف کے بعد بولا۔

"انارکلی! میں تمہیں ایک بے رحم اور ظالم انسان کے پنجہ میں موت کا شکار بنا کر نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا"

سلیم نے اس کو سختی سے لے جانا چاہا۔ لیکن انارکلی نے خود کو چھڑا لیا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرے پیارے سلیم۔ میری زندگی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ اب گل ہونے والا ہے۔ موت کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلتی اب زندہ بچ رہنے کی کوشش کرنا فضول سی بات ہے۔ شہنشاہ جو کچھ بھی ہیں ہمارے آقا ہیں۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ خدائی فرمان ہے تم میرے ساتھ کیوں چلتے ہو؟ جبکہ تمہیں اس بات کا یقین کامل ہے کہ ہمارا تعاقب ضرور کیا جائیگا۔ کیا تم اپنی حفاظت میں کام کرنے والے طریقوں پر غور کر لیا ہے"

سلیم پریشان سا ہوگیا۔ لیکن اس نے فوراً جواب دیا۔

"اس وقت میں ان باتوں کی تشریح کرنے کے ناقابل ہوں اور

نہ ہی یہ موقعہ ضائع کرنے کا ہے میرا باپ ظالم اور بے رحم ہے میں اس کے ظالمانہ احکام کی تعمیل کرنے سے انکاری ہوں۔ وہ ہر ایک کو اپنے ظلم کے تابع رکھنا چاہتا ہے ——

ہمیشہ کے لئے دہلی کے شاہی تخت کا مالک بھی کوئی ایک نہیں رہ سکتا۔ میں بھی جلد یا بدیر اس تخت پر بیٹھوں گا۔"

انارکلی نے نہایت خاموشی سے یہ سب کچھ سنا سلیم ہرگز اس بات کو نہ سمجھ سکا۔ کہ انارکلی کے انکار کی وجہ کیا ہے یہ کس لئے قید خانہ سے رہا ہونے کو تیار نہیں۔ اور اس طرح موت سے دوچار ہونا چاہتی ہے۔

"وقت جا رہا ہے انارکلی پیاری —— چلو —— برائے خدا چلو" سلیم نے ملتجی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

لیکن انارکلی نے یہ خیال کر کے کہا۔ کہ

"اس کو بھی آنچ نہ لگے" انکار کرتی رہی

آخر سلیم تنگ آگیا۔ اور پرجوش لہجے میں بول اٹھا۔ انارکلی یہ انکار کس لئے۔ تمہاری دید کے بغیر میں کیسے زندہ رہونگا۔ پیاری اگر تو وادئ موت کیطرف جانا چاہتی ہے۔ تو میں بھی ہمسفر ہی ہوں تو جب تک میرے ہمراہ نہ چلے گی میں ہرگز اس جگہ سے نہ ہلوں گا۔"

انارکلی میں انقلاب سا آگیا۔ وہ گھبرا کر بول اٹھی۔

"تو کیا اب بھی وقت ہے۔ ہم یہاں سے بھاگ سکتے ہیں؟"

"ہاں آسانی سے۔ بے خوف بہادروں کی طرح اب بھی وقت ہے"
سلیم نے جواب دیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔"
کھٹ کھٹ
دروازہ کھٹکا۔ اور کھل گیا۔ ایک انسان برق رفتاری سے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اور ہانپتے ہوئے سانس روک کر۔
"شہزادہ صاحب! بادشاہ سلامت اسی راستہ سے آرہے ہیں"
"اب کیا ہوگا۔"
سلیم نے گھبرا کر پوچھا۔
اس نے جواب دیا۔
"وقت کو ضائع نہ کریں حضور آپ اسی وقت اس جگہ سے چلے جائیں۔ جب بادشاہ سلامت لوٹ جائیں۔ تب پھر تشریف لے آئیں۔
اچھا باہر ٹھہرو رحیم خاں۔ میں ابھی آتا ہوں۔
سلیم نے حکم دیا۔ اور محافظوں جیسا لباس جسکو کہ وہ ساتھ لیتا آیا تھا۔ زیب تن کر لیا۔ تھوڑے توقف کی خاموشی کے بعد اس نے انارکلی کو اپنے سینے سے لگا کر بوسہ لیتے ہوئے چراغ گل کر دیا۔
انارکلی نے سلیم کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اشکبار آنکھوں سے مایوس نظروں سے لیکن اسکی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ نہ وہ ہی اپنی جگہ سے ہل سکی۔ یہاں تک کہ وہ بوسہ کا جواب بھی نہ دے سکی۔

سلیم کے چلے جانے کے بعد اس نے وہاں سے نکلکر بھاگنے کی امید کو آخری سلام کر دیا۔

نارنجی نے پھر وہاں خوفناک تنہائی کا دور دورہ کیا۔ اور انارکلی ویسے کی ویسے ہی رہ گئی۔

انارکلی کی کوٹھڑی میں کوئی بھی نہ آیا۔ رحیم خاں نے بالکل جھوٹ ہی کہہ دیا تھا۔ نہ اکبر تھا۔ نہ اس کا سایہ۔

شہزادے جانباز کے دستوں کا ایک گروہ تھا جسمیں رحیم خاں شریک تھا جب ایک دفعہ شہزادے نے بادشاہ کی زندگی میں علم بغاوت بلند کرنے کی تیاری کی تھی۔ تو رحیم خاں ان لوگوں میں تھا جنہوں نے شہزادے کا ساتھ آخر دم تک دینے کا عہد کیا تھا۔ رحیم خاں جیل خانے کا داروغہ تھا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ سلیم محض انارکلی سے الوداع کہنے آیا ہے اسے یہ خبر نہ تھی۔ کہ وہ انارکلی کو وہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کریگا۔

جب سلیم کمرے میں داخل ہوا۔ تو رحیم خاں کو یہ شوق ہوا کہ دیکھوں اس نازک وقت میں جذبات محبت کے متوالوں میں کیا بات چیت ہوتی ہے۔ وہ دروازے پاس آکر کھڑا ہوا۔ اور اس نے ان کے وہاں سے بھاگ جانے کی تجویزیں سن لیں۔ جب رحیم خاں نے دیکھا کہ وہ انارکلی کو وہاں سے لے جانے کی فکر میں ہے۔ تو اس نے جان بوجھ کر اس کو روک دینا چاہا۔

آخر وہ کیا کرتا۔ اگر قیدی کو بھاگ جانے دیتا۔ تو اسکی جان خود خطرے میں پڑ جاتی۔ لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکتا تھا۔ کہ کھلم کھلا شہزادے کو ناخوش کر دے۔ بادشاہ اب بڈھا تھا۔ اور سلیم جلد ہی بادشاہ ہونے والا تھا۔ اس لئے رحیم خان نے سوچا۔ ایسی تدبیر ہو کہ کام بھی نکل جائے اور شہزادہ بھی ناخوش نہ ہو۔

جب سلیم باہر آیا۔ تو رحیم خان نے دور دور مشعلیں جلتی ہوئی دکھائیں یہ اس کے آدمی لئے ہوئے جا رہے تھے۔ سلیم نے پھر کر ان کی طرف نہ دیکھا۔ وہ بادشاہ کے خلاف کھلم کھلا کوئی کام نہ کرنا چاہتا تھا۔

رحیم خاں نے سلیم کو گلیوں اور سڑکوں سے ہوتے ہوئے شہزادے کو محل تک پہنچا دیا۔

"رحیم خاں! تم ٹھیک جانتے ہو کہ وہ بادشاہ ہی تھا؟"

"جی حضور!"

"آخر بادشاہ وہاں کیسے تشریف لائے اور کیوں؟"

"حضور کو معلوم ہوگا۔ کہ اکثر بادشاہ جیل خانوں کا معائنہ کرنے بغیر اطلاع تشریف لاتے ہیں۔"

"ہاں اتنے دنوں تو بادشاہ نے لوگوں کو تعجب میں ڈالا ہے۔ اب بہت جلد خود اس کو متعجب ہونا ہوگا۔" سلیم نے یہ فقرہ نہایت معنی خیز انداز سے کہا تھا۔

رحیم خاں اب سخت متحیر تھا۔ اس کو معلوم تھا۔ کہ کچھ دیر میں شہزادہ

انارکلی کو جیل خانے سے نکال لے جانے کی غرض سے پھر جائیگا. اب کیا کرنا چاہیئے۔ وہ قیدی کا قید خانے سے نکل جانا روا نہ رکھ سکتا تھا۔

"حضور کی اجازت ہو تو غلام تھوڑی سی شراب پیش کرے"

سلیم کا حلق مارے غصہ کے خشک ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"خیر ذرا سی شیرازی لے آؤ"

رحیم خاں وہاں سے گیا۔ اور تھوڑی شراب لے آیا۔ اور کمر بند سے ایک پڑیا نکال کر شراب میں گھول دی۔ یہ ایک سفید رنگ کا سفوف تھا۔ شراب میں کچھ جھاگ پیدا ہوئی۔ اور پھر اپنی حالت پر آگئی۔

سلیم شراب کا انتظار کر رہا تھا۔ رحیم خاں کا پیالہ پیش کرنا تھا۔ کہ سلیم کے حلق سے نیچے تھی۔ تھوڑی اور لاؤ۔ رحیم خاں اور شراب لایا اور سلیم نے پھر غٹ غٹ پی لی۔ اب شراب نے اپنا رنگ جمانا شروع کیا۔ اس نے مجنونانہ جوش سے کہا "رحیم! رحیم! مجھے انارکلی کے پاس لے چلو"

"حضور غلام کو کوئی عذر نہیں ہے لیکن ......"

"لیکن۔ لیکن کیا؟"

"ممکن ہے کہ بادشاہ ابھی وہیں ہوں"

"بھائی جان بادشاہ کو چوکیدار کے گھرانے میں پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ وہ بادشاہی کے قابل نہیں ہے۔ جاؤ دیکھو۔ اس وقت بادشاہ کہاں ہیں؟"

رحیم نے سر تسلیم خم کیا۔ اور وہاں سے چل دیا۔ اس کو یقین تھا۔ کہ شہزادہ صبح تک ہوش میں آئے گا۔

انارکلی سلیم کے واپس آنے کا انتظار کرتی رہی لیکن سلیم نہ آیا انتظار نے سخت پریشان کیا لیکن امید نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ یہی کہتی رہی۔ کہ ممکن ہے سلیم اب بھی آتا ہو۔

صبح کا سپیدہ جھلک رہا تھا۔ اور انارکلی کے تنگ حجرے کی تاریکی اب تنگ ہو چلی تھی۔ دفعتاً اسکو قریب ہی کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ یہ وہی انگوٹھی تھی۔ جو انارکلی کی ماں نے اسکو دی تھی اور کہا تھا۔ کہ خدا نہ کرے کہ بیٹی تجھ کو کبھی اس کے استعمال کی ضرورت ہو۔ لیکن جب دنیا میں امید کی دھندلی سی روشنی بھی باقی نہ رہے۔ اور مستقبل بالکل تاریک نظر آئے۔ تب اسکو چاٹ لینا۔ انارکلی کو آج اپنی ماں کی باتوں کی اصلیت معلوم ہوئی۔ اس نے انگوٹھی دباکر اپنی مٹھی میں رکھ لیا۔ فوراً اسے بچپن کا زمانہ اور اسکی تصویر اسکی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ تب سلیم کی محبت کے جذبات بھی اسکے دل میں موجزن ہونے لگے۔ اسکے بعد از خود رفتگی شروع ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر میں انارکلی وہاں تھی جہاں سے کوئی خبر نہیں آتی۔

جب بادشاہ کے آدمی وہاں پہنچے۔ کہ اسکو سزائے موت دیں۔ تو پہلے دروازہ کھولنے میں کچھ تامل ہوا۔ جب دروازہ کھلا تو آفتاب کی روشن کرنوں نے انارکلی کے چہرے کو منور کر دیا۔ وہ ایک حسن کی

دیوی تھی۔ وہ واقعی انارکلی تھی۔ اور اس کا نام اب بھی اسکے رخساروں اور ہونٹوں کے حسن پر پھبتا تھا۔

اب وہ اس بادشاہ حقیقی کے سامنے کھڑی تھی۔ جسکے آگے اکبر ایسے شہنشاہ کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔

خاندان بابر کا سب سے زیادہ شاندار بادشاہ اب جنت میں آرام کرتا ہے اور سلیم تخت شاہی پر نورالدین جہانگیر کے نام سے جلوہ افروز ہے انارکلی کی موت کا واقعہ اس شکستہ دل عاشق کے دل سے بھی محو ہو چکا ہے۔ اب اس نے عیش و عشرت کے دوسرے پیالوں کی چاشنی چکھ لی ہے۔ اس نے مہرالنسا کو دیکھا۔ اور مہرالنسا کی محبت کے سامنے انارکلی کا عشق ویسا ہی تھا۔ جیسے نصف النہار پر چمکتے ہوئے آفتاب کے آگے جگنو کی چمک بے بضاعت اور حقیر معلوم ہوتی ہے یہ وہی مہرالنسا ہے جسے دنیا نورجہاں کے نام جانتی ہے۔ اب بادشاہ کے دل و دماغ پر سوتے جاگتے نورجہاں کا قبضہ ہے۔

شام کا وقت تھا۔ جہانگیر شاہی باغیچے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ حیف اب تک تیری اس سچی محبت پر بھی مہرالنسا کا دل نہیں پسیجتا۔

وہ ٹہل ہی رہا تھا۔ کہ یکایک اس کی نگاہ ایک انار کے نیچے جس میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور کلیاں لگی

ہوئی تھیں۔ ایک چھوٹی سی قبر پر پڑی۔ اس نے قبر اس سے پہلے بھی دیکھی تھا۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ اس میں کون دفن ہے۔ ایک بوڑھا مالی کچھ فاصلے پر پھولوں کی کیاری میں کام کر رہا تھا۔ جہانگیر نے اسے بلایا اور پوچھا "کہ یہ کس کی قبر ہے؟"

مالی نے پہلے قبر کی جانب دیکھا۔ کچھ سوچا اور بادشاہ کی جانب دیکھ کر چپ ہو گیا۔ اس کا دل خوفزدہ ہو گیا۔ شہزادے نے پھر پوچھا "اس میں کون دفن ہے؟"

باغبان نے رکتے رکتے کہا "انارکلی بیگم"

"انارکلی" رفتہ رفتہ بادشاہ کے دل میں پرانے واقعات تازہ ہو گئے۔ اس نے مغرب کی جانب نگاہ کی۔ ایک چمکدار ستارہ اُفق کے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اور اسی کے ساتھ انارکلی کی یاد بادشاہ کے دل میں ترقی کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ مہرالنسا کو بھی بھول گیا جس طرح کئی سال ہوئے انارکلی کو اس نے دیکھا تھا۔ وہی صورت اس کی نظروں کے سامنے پھر گئی۔ اس کی قابل ناشعور موت کے واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ اس کو انارکلی کا تبسم یاد آگیا جس کی ایک

ادا قسمت جہانگیر یا سلیم کی جان تھی۔ اسے رحیم خان کا وہ دعا بھی یاد آیا۔

جہانگیر فکر میں ڈوب گیا۔ اور آہستہ آہستہ محل کو واپس چلا۔

دوسری صبح داروغہ عمارات کو حکم ہوا۔ کہ وہاں ایک عالی شان عمارت تعمیر کر دی جائے۔ اور یہ شعر اس عالیشان عمارت پر کندہ کر دیا جائے ؎

تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را
آہ! گر من باز بینم روئے یار خویش را

شادی

کسی زمانے میں تانجور کے پاپو مشہور زمیندار رہا کرتے تھے سالانہ خرچ اخراجات کے لئے مشہور تھے کہتے ہیں کہ وہ ڈھاکہ کی ململ کا کھڑا کنارہ پھاڑ دیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ ان کی نازک جلد کے ساتھ چھو کر چبھتا تھا۔ گڑیا کی شادی پر بھی وہ ہزاروں روپے صرف کر دیا کرتے تھے۔
ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک خاص جشن کے موقعہ پر جو نہایت شان و شوکت سے منایا جا رہا تھا۔ رات کو دن میں تبدیل کرنے کے لئے انہوں نے بیشمار لیمپ و فانوس جگائے۔ اور آسمان سے چاندی کی تاریں برسائیں تاکہ سورج کی کرنوں کی مانند ہوں۔

یہ حضرت نوح کے طوفان سے پہلے کی باتیں ہیں۔ انقلاب آیا

ان پرانے زمانے کے بابوؤں کی نسل جو شاہانہ شان و شوکت سے رہتے تھے۔ دیر تک قائم نہ رہ سکی جسطرح ایک لیمپ کا تیل جس میں بہت سی بتیاں جل رہی ہوں۔ جلد خرچ ہو جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے ٹمٹما کر بجھ جاتا ہے۔ بعینہٖ اس خاندان کی حالت ہوئی۔

ہمارا پڑوسی کالی بابو اس گذشتہ شان و عظمت کا آخری ٹمٹماتا چراغ ہے۔ اسکے جوان ہونے سے پیشتر ہی اس عالیشان خاندان کی شان و شوکت کا چراغ تقریباً بجھ جاتا تھا۔ جب اس کا والد انتقال کر گیا تو مرگ کے اخراجات کی مشکل میں آنکھوں کو چندھیانے والی ایک زور کی چمک دے کر یہ چراغ بالکل بجھ گیا اور نتیجہ کے طور پر دیوالیہ دار ہوا۔ قرض چکانے کے لئے جائداد فروخت کرنی پڑی۔ جو کچھ نقد روپیہ باقی بچا وہ بزرگوں کی شان و شوکت و شاہانہ اخراجات قائم رکھنے کے لئے بالکل ناکافی تھا۔ نا مجبور چھوڑ کر کالی بابو کلکتہ چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا لڑکا اس جہان فانی سے کوچ کر گیا اور ایک لڑکی پیچھے چھوڑ گیا۔

کلکتہ میں کالی بابو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ ہمارے خاندان کی کہانی ان کے خاندان کی تواریخ سے بالکل مختلف ہے۔ میرے والد نے اپنی محنت سے روپیہ کمایا۔ انہیں اس بات کا فخر تھا کہ ضرورت سے زیادہ ایک پائی بھی کبھی فضول

خرچ نہیں کی۔ ان کا لباس اور ہاتھ ایک معمولی حیثیت کی مانند تھے۔ جو ہاتھ سے محنت کر کے روٹی کماتا ہے فضول خرچ اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے انہوں نے کبھی بابو کا لقب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس کے لیئے میں ان کا اکلوتا بیٹا ان کا مشکور ہوں۔ انہوں نے مجھے نہایت اعلےٰ تعلیم دلوائی۔ اور دنیا میں ترقی کرنے کے قابل بنایا۔ مجھے یہ ماننے میں مطلق شرم نہیں کہ دنیاوی ترقی کے لحاظ سے میں ایک خودساختہ انسان ہوں۔ میری الماری میں پڑے ہوئے چند نوٹ مجھے زیادہ عزیز ہیں۔ بہ نسبت ایک شجرہ نسب کے جو ایک خالی خاندانی الماری میں پڑا ہوا ہو۔

میرے خیال میں یہی وجہ تھی کہ کالی بابو کے بابو خاندان کی شہرت کے وقت انکے آبائی بنک میں سے جس کا اس وقت دیوالہ نکلا چاہتا تھا۔ بذریعہ چیک پبلک کریڈٹ پر روپیہ لینا مجھے نہایت ناگوار گزرتا تھا۔ میں دل میں خیال کیا کرتا تھا۔ کہ کالی بابو مجھے اس وجہ سے حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے کہ میرے والد نے اپنے ہاتھوں سے محنت کر کے روپیہ کمایا تھا۔

مجھے اس بات کا خیال ہونا چاہیئے تھا۔ کہ سوائے میرے اور کوئی شخص کالی بابو سے کسی طرح کبیدہ خاطر نہیں تھا۔ دراصل اس جیسا ضعیف شخص جو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتا۔ ملنا مشکل تھا۔ شادی غمی کے موقعہ پر اس کا سلوک ہمیشہ انسانیت اور شرافت کا ہونا تھا۔

اپنے پڑوسیوں کی تمام رسوم اور مذہبی موقعوں و تہواروں میں وہ ہمیشہ شامل ہوتا تھا۔ بچے بوڑھے سے بلا تمیز وہ خندہ پیشانی سے بات کرتا تھا۔ گھر کے معاملات کی تفصیل پوچھنے میں اس کی ہمدردی شرافت جھلکنے والی تھی۔ اس کے دوست مجبوراً اس کے مندرجہ ذیل قسم کے ریمارکوں کا سلسلہ اسکی زبان سے سننے کیلئے ٹھیر جاتے تھے۔

پیارے تمہیں ملکر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ تم راضی ہو نا؟ شانتی کا کیا حال ہے؟ اور دادا کیسا ہے؟ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے ابھی ابھی پتہ لگا ہے۔ کہ مادھو کے لڑکے کو بخار چڑھ گیا ہے۔ اب وہ کیسا ہے؟ اور میری چندن بابو سے ملے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ وہ بیمار نہیں ہے۔ مکھن لال کہاں ہے۔ اور کیسے ہے؟ اور ہاں تمہارے ہاں مستورات کا کیا حال ہے؟ خوش تو ہیں؟

کالی بابو ہر وقت اجلا اور صاف لباس پہنتا تھا۔ اگرچہ اس کے کپڑوں کا سٹاک بہت تھوڑا تھا۔ ہر روز اپنی قمیص، واسکٹ، کوٹ اور پتلون، لحاف تکیہ اور چھوٹی سی دری جس پر وہ بیٹھا کرتا تھا دھوپ میں رکھتا تھا۔ کہ خشک رہیں۔ جب ذرا ہوا لگ جاتی تو وہ انہیں ملا کر برش سے جھاڑتا اور سنبھال کر رکھ لیتا تھا۔ اس کا تھوڑا سا فرنیچر یعنی کرسی وغیرہ، کمرے کی قدرے آرائش کا باعث تھا۔ اور اس بات کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ کہ ضرورت کے وقت اور بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ اکثر جب کوئی نوکر موجود نہ ہوتا۔ تو تھوڑی دیر کے لئے وہ مکان

بند کر دیتا۔ اور قمیض اور دوسرے کپڑے دھوپ میں سوکھنے ڈال دیتا اور دیگر اسی قسم کے معمولی کام کرتا۔ جب یہ کر چکتا۔ تو دروازے کھول دیتا۔ اور پھر دوستوں سے جو ملاقات کے لئے آتے ملتا تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اگرچہ کالی بابو تمام زمین ہاتھ سے کھو بیٹھا تھا لیکن بزرگوں کی تھوڑی سی جائداد ابھی اس کے قبضے میں باقی تھی منجملہ ان کے ایک خوشبودار پانی چھڑکنے کا گلاب دان۔ ایک عطردانی جس پر میناکاری ہوئی تھی۔ ایک سنہری طشتری ایک نایاب دوشالہ ایک پرانے زمانے کی خلعت اور ایک بزرگوں کی خاندانی پگڑی تھی۔ یہ چیزیں اس نے بمشکل قرض خواہوں کے پنجے سے چھڑائی تھیں۔ ہر ایک مناسب موقع پر وہ ان اشیاء کو سجا کر رکھتا۔ تاکہ سب دیکھ سکیں۔ اور نائیجور کے بابوؤں کا عزو وقار اور شان و شوکت جس کے لئے ان کی ایک عام شہرت تھی اس گئے گزرے زمانے میں بھی تھوڑی بہت قائم رہ سکے۔

باطن اس کا نہایت صاف اور ایک حلیم الطبع انسان کا سا تھا۔ لیکن ظاہرا گفتگو میں آزادانہ طور پر اپنے خاندان پر فخر و ناز کرنا اپنا ضروری بلکہ مقدس فرض سمجھتا تھا۔ اس کے دوست آشنا بھی اسے ایسا کرنے میں امداد دیتے تھے۔ اور اس شغل میں خوب خط اڑاتے تھے۔

اڑوس پڑوس کے لوگ جلدی اسے ٹھاکر دادا کے نام سے

پکارنے لگ گئے وہ اس کے گھر میں جمع ہو جاتے اور گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ اس کا خرچ بچانے کیلئے کالی بابو کا کوئی نہ کوئی دوست اس کے لئے تمباکو لے آتا اور کہتا۔

"ٹھاکر دادا! آج یہ تمباکو ہمارے ہاں گیا سے آیا ہے دیکھو تو بھی پینے میں کیسا ہے"؟

ٹھاکر دادا حقہ میں بھر کر پیتے اور کہتے۔

"بہت اچھا ہے"

پھر وہ کسی نفیس تمباکو کا جو اس کے بزرگ نائیجیریا میں پرانے وقتوں میں پیا کرتے تھے۔ اور جو ایک اشرفی کا ایک تولہ آتا تھا ذکر چھیڑ دیتا تھا۔ اور یوں در افشانی کرتا۔

"میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ حاضرین میں سے کسی کو وہ تمباکو پینے کا شوق ہے۔ میرے پاس تھوڑا سا موجود ہے۔ اور جلد منگوا سکتا ہوں"

ہر ایک جانتا ہے کہ اگر وہ کہتے کہ ہاں پئیں گے تو کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لینا لازمی امر ہے۔ مثلاً کہ الماری کی چابی کھوئی گئی ہے۔ اور کہ ملازم گنیش کہیں رکھ گیا ہے۔ کالی بابو کہا کرتا۔

"جس گھر میں نوکر ملازم ہیں۔ پتہ نہیں لگتا۔ چیز کہاں جاتی ہے۔ اب اس گنیش کو ہی جس کی بیوقوفی میں بیان کرنے سے قاصر ہوں لے لیجئے۔ یہ ایسا نالائق ہے۔ مگر میرا دل اجازت نہیں دیتا۔ کہ اسے برداشت کر دوں"

کالی بابو کے خاندان کی عزت کی خاطر گنیش ہر ایک الزام برداشت کرنے کو تیار رہتا۔

ایسے موقعہ پر اکثر حاضرین میں سے ایک بول اٹھتا۔

"ٹھاکر دادا! کچھ مضائقہ نہیں ڈھونڈھنے کی تکلیف نہ کیجئے۔ جو تمباکو ہم پی رہے ہیں کافی اچھا ہے تمہارے والا ذرا تیز ہوگا۔"

اس پر کالی بابو کو ذرا اطمینان ہوتا۔ اور گفتگو اس مضمون پر ختم ہوکر اور مضامین پر جاری رہتی ہے۔ جب مہمان جانے کے لئے اٹھتے۔ ٹھاکر دادا دروازے تک انہیں چھوڑنے جاتا۔ اور دہلیز پر کھڑا ہوکر کہتا۔

ہاں ایک بات رہ گئی۔ آپ لوگ میرے ہاں دعوت کب کھائینگے؟

ہم میں سے کوئی جواب دیتا۔

"ٹھاکر دادا! ابھی نہیں پھر کبھی سہی۔"

"بہت اچھا مناسب ہوگا اگر ہم موسم برسات تک انتظار کریں ابھی بہت گرمی ہے۔ آجکل کے موسم میں جیسی شاندار ضیافت میں تم لوگوں کو دینی چاہتا ہوں ہاضمہ بگاڑ دیگی اور باعث نقصان ہوگی۔"

جب موسم برسات شروع ہوجاتا تو ہم اسے اس وعدہ کی نسبت یاد نہیں دلاتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے یہ مضمون چھڑ جاتا تو کوئی دوست نرمی سے صلاح دیتا۔ کہ جب بارش ہورہی ہو۔ تو ادھر ادھر آنا جانا بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہوکہ برسات ختم ہولینے دیں۔ اسطرح

سے بازی جاری رہتی۔

بلحاظ اسکی حیثیت کے ٹھاکر داداکا مکان بہت چھوٹا تھا۔اور ہم اس معاملے میں اس سے ہمدردی کیا کرتے تھے۔ اسکے دوست اسے یقین دلاتے۔ کہ ہم تمہاری مشکلات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ کلکتے میں اچھے مکان کا ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے دراصل برسوں وہ کالی بابو کے لئے ایک موزوں مکان تلاش کرتے رہے تھے مگر شاید میرے لکھنے کی ضرورت نہیں کہ کوئی شخص اسکے لئے موزوں مکان حاصل کر لینے کی بے وقوفی کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ ٹھنڈا سانس بھر کر اور بتوکل خدا ٹھاکر دادا کہا کرتے تھے۔

"خیر آخر مجھے اسی مکان میں گزارہ کرنا پڑیگا میرے لئے دوستوں کی جدائی برداشت کرنا ناممکن ہے۔ تمہارے نزدیک موجود ہونا تمام مشکلات کا کفارہ کر دیتا ہے۔

اسکے بعد وہ مسکرا دیتے۔

بعض اوقات یہ باتیں میرے دل پر بہت گہرا اثر کرتیں میں سوچتا کہ اصل وجہ یہ ہے۔ کہ جب ایک آدمی جدائی کی حالت میں ہوتا ہے۔ تو وہ احمقوں کی سی باتیں کرنا کبیرہ گناہ خیال کرتا ہے۔ کالی بابو دراصل احمق یا بے وقوف نہیں تھا معمولی کاروبار میں ہر ایک شخص کی صلاح لینا مناسب خیال نہیں کرتا تھا۔ لیکن نائینجور کی بابت اس کی گفتگو یقیناً عقل سے بعید معلوم ہوتی

تھی۔ چونکہ ظاہرا مذاقیہ محبت جو ہم لوگوں کو اس سے تھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ کہ ہم اس کے ناممکن الیقین بیانات کے خلاف بولنے کے لئے لب کشائی کریں۔ اس لئے وہ گفتگو میں مناسب حدود کے اندر نہیں رہ سکتا تھا۔ جب لوگ اس کے سامنے نائیجیر کی شاندار تواریخ مبالغہ آمیز و مضحکہ خیز پیرایہ میں بیان کرتے تو وہ ہر ایک لفظ پر نہایت سنجیدگی سے یقین کر لیتا۔ اور کبھی خواب میں بھی خیال نہ کرتا۔ کہ کوئی شخص ان باتوں کو جھوٹا اور ناقابل اعتبار سمجھ سکتا ہے۔

جب میں بیٹھ کر نہایت غور و خوض سے ان خیالات کو جو میرے دل میں بابو کی نسبت تھے۔ سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ کالی بابو سے جو نفرت مجھے ہے۔ اسکی زیادہ گہری وجہ یہ بھی جسے میں اب بیان کروں گا۔

اگرچہ میں ایک امیر باپ کا بیٹا ہوں اگر چاہتا تو کالج میں وقت اور روپیہ ضائع کر سکتا تھا۔ لیکن میری محنت کا یہ پھل نکلا۔ کہ جب میں نوجوان ہی تھا۔ میں نے کلکتہ یونیورسٹی کی ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی میرا چال چلن نہایت اعلےٰ اور رشک و شبہ سے بالاتر تھا۔ دیکھنے میں خوش شکل اور وجیہہ تھا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں۔ کہ میں ایک خوبصورت جوان تھا۔ تو یہ خودستائی خیال کی جائے تو کی جائے لیکن کوئی اسے جھوٹ خیال نہیں کر سکتا تھا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ میرے والدین کا خیال تھا۔ کہ بنگال کے نوجوانوں میں میں ایک نہایت قابل نوجوان بلحاظ شادی ہوں اس لحاظ سے مجھے بھی کوئی شک نہ تھا۔ اور میں نے ارادہ کر لیا تھا۔ کہ شادی کے بازار میں اپنی پوری قیمت پا کر چھوڑوں گا۔

جب میں نے یہ سوچا کہ میری پسند خاطر بیوی کیسی ہے تو میرے دل کی آنکھوں کے سامنے ایک مالدار صاحب حیثیت شخص کی لڑکی جو دیکھنے میں حسین ماہ جبین اور اعلیٰ تعلیمیافتہ تھی کی تصویر کھچ گئی

ہر جانب دور و نزدیک سے سگائی کی تجویزیں آنے لگیں۔ انہوں نے نقد رقمیں پیش کیں۔ میں نے یہ پیش کش سختی سے بلا کم و کاست اور بلا رو و رعایت اپنی عقل کی ترازو میں تولیں۔ تو ایک بھی نہ نکلی جسے اپنا عمر کا ساتھی بنانے کے قابل سمجھتا۔ بھا بھوتی شاعر کے الفاظ میں مجھے یقین ہو گیا۔ کہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا وقت آئے۔ کہ اس دنیا میں جو وقت اور جگہ کی قید سے آزاد ہے ایسی لڑکی پیدا ہو جائے۔ جو میری شاہانہ زندگی کی شریک ہونے کی مستحق کہلا سکے مگر موجودہ زمانے میں آج کل کے بنگال کے چھوٹے سے قطعہ زمین میں ایسی بے مثل لڑکی کا پیدا ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور دکھائی دیتا تھا۔

اس اثنا میں وہ والدین جو مجھ پر نظر رکھتے تھے۔ ہر طرح سے میری صفتوں کے راگ گاتے رہے۔ اور میری تعریفوں کے پل

باندھتے رہے ہیں یہ تعریف اپنا حق تصور کیا کرتا تھا۔ کیونکہ میں اپنے خیال میں ایسا ہی نیک تھا جیسے ہیں کہ جب دیوتا ہم فانی انسانوں کو اپنی بخششوں سے محروم رکھتے ہیں۔ تو ان کا عقیدت مندی سے اقرار کریں۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو دیوتا لوگ ناراض ہو جاتے ہیں۔ میرے دل میں بھی یہ دیوتاؤں جیسی خراج تحسین و آفرین وصول کرنے کی خواہش جاگزیں ہو گئی تھی۔

میں پیشتر ذکر کر چکا ہوں کہ ٹھاکر دادا کی اکلوتی پوتی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو اکثر دیکھا تھا۔ مگر کبھی خیال نہیں کیا تھا۔ کہ وہ خوبصورت ہے۔ میرے دل میں کبھی خیال تک نہ گذرا تھا۔ کہ وہ میری ہمراز و غمگسار بن سکتی ہے۔ باوجود اس کے مجھے یقین تھا۔ کہ ایک نہ ایک دن کالی بابو مجھ سے ضرور درخواست کرے گا۔ کہ میں اس ناچیز تحفہ یعنی اس کی پوتی قبول کروں۔ دراصل کالی بابو سے میری اندرونی کاوش کا یہی راز تھا۔ میرے دل میں سخت غصہ تھا۔ کہ اس نے ابھی تک کیوں ایسا نہیں کہا ہے۔

میں نے سنا تھا کہ دادا نے اپنے دوستوں سے کہا ہے۔ کہ ناگینچور کے بابو کسی سے کوئی درخواست نہیں کیا کرتے۔ خواہ لڑکی کنواری رہے وہ خاندان کی آن نہیں چھوڑے گا۔ ہاں یہ میرے لئے ناممکن تھا کہ صرف اپنے غصے کے اظہار کی خاطر اس ضعیف شخص کو سزا دوں۔ اور بہت عرصہ تک میں نے کچھ

نہ کہا سُنا۔ مگر اچانک ایک روز مجھے ایک ایسی عجیب سی تجویز سوجھی کہ میں اسے عمل میں لانے کی خواہش کو نہ روک سکا۔

پیشتر ذکر ہو چکا ہے۔ کہ کالی بابو کے دوست اسکی تعریفوں کے پل باندھ باندھ کر اسے مغرور کر دیتے تھے۔ ایک دوست نے جو ریٹائرڈ ملازم گورنمنٹ تھا اسے کہا تھا۔ کہ جب کبھی میں چھوٹے لاٹ صاحب سے ملتا ہوں تو وہ نائینجو کے بابوؤں کی بابت ضرور تازہ خبر دریافت کرتے ہیں۔ اور سُنا ہے کہ چھوٹے لاٹ صاحب کہتے ہیں۔ کہ تمام بنگال میں حقیقی معزز خاندان مہاراجہ کالی پور اور نائینجو کے بابوؤں کے ہیں۔ جب کالی بابو نے یہ سفید جھوٹ سُنا تو اسے بڑا فخر ہوا۔ اور اکثر یہ کہانی دوہرایا کرتا۔ اس کے بعد جب کبھی اس شخص سے ملتا تو علاوہ اور باتوں کے یہ ضرور پوچھتا۔

"کہو چھوٹے لاٹ صاحب کیسے ہیں؟ اچھے ہیں نا؟ مجھے یہ سنکر بڑی خوشی ہوگی۔ کہ وہ اچھی طرح ہیں۔ اور میم صاحب کا کیا حال ہے؟ اور ننھے بچے! یہ بڑی خوشخبری ہے ان سے جب تم ملو۔ تو میرا سلام ضرور کہنا"

کالی بابو اکثر کہا کرتا تھا۔ کہ میرا ارادہ ہے کہ لاٹ صاحب سے ملاقات کروں۔ مگر یہ فرض کرنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں۔ کہ کئی بڑے اور کئی چھوٹے لاٹ آئیں گے اور چلے جائینگے۔ پیشتر اس کے کہ کالی بابو اپنی خاندانی بگھی آراستہ کر کے گورنمنٹ ہاؤس کی جانب روانہ ہو سکے گا۔

ایک روز کالی بابو کو ایک طرف لے جا کر میں نے اس کے کان میں کہا۔

"ٹھاکر دادا۔ کل میں لاٹ صاحب کے ہاں دعوت کے موقع پر حاضر تھا۔ وہ تمہارا ذکر کر رہے تھے۔"

میں نے کہا۔ "کالی بابو کلکتہ چلے آئے ہیں۔"

"انہیں اس بات کا سخت رنج ہے کہ آپ نے ان سے ملاقات نہیں کی انہوں نے کہا کہ ہم تمام رسمی تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر آج شام کالی بابو سے ان کے مکان پر خود پرائیویٹ طور پر ملاقات کرنے کی غرض سے آئیں گے۔"

کوئی اور شخص ہوتا تو ایک منٹ میں میری شرارت تاڑ جاتا اور اگر یہ دیدہ دانستہ کسی اور شخص سے کہا جاتا تو بھی کالی بابو فوراً سمجھ جاتا۔ مگر چونکہ اپنے دوست کی زیادتی جو ملازم دفتر سرکاری تھے۔ بہت کچھ سن چکے تھے۔ اور خود بھی خوب مبالغہ آمیز گپیں اڑا چکے تھے۔ اس لئے انہیں لفٹیننٹ گورنر کا ان کے گھر چل کر آنا ایسا معلوم دیا کہ مبالغہ سے بری ہے اور عین اغلب بلکہ درست ہے یہ خبر سنکر کالی بابو قدرے گھبرا گیا۔ لاٹ صاحب کی ملاقات کی ہر ایک تفصیل کے متعلق اسے تکردامن گیر ہوئی۔ خاص کر انگریزی زبان سے اپنی ناآشنائی کے متعلق اسے بہت فکر ہوا۔

"کہ اس مشکل کا کیا علاج کیا جائے۔"

"یہ کوئی تشویش کا باعث نہیں ہے آپ گھبرائیے نہیں انگریزی زبان سے ناواقف ہونا اس کا ثبوت ہے کہ آپ ایک عالی و معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاٹ صاحب ہمیشہ ایک مترجم ہمراہ رکھتے ہیں۔ اور انہوں نے خاص طور پر ذکر فرمایا ہے کہ یہ ملاقات پرائیویٹ ہو گی"

دوپہر کے قریب جب تمام پڑوسی یا تو اپنے کام میں مصروف تھے یا سو رہے تھے۔ کالی بابو کے مکان کے سامنے ایک گاڑی آکر ٹھیری دو باوردی سپاہی سیڑھیاں چڑھ آئے اور بلند آواز سے بولے۔

"چھوٹے لاٹ صاحب حضور!"

پرانے فیشن کی خلعت اور دیگر لباس زیب تن کئے اور خاندانی دوپٹہ پہنے کالی بابو استقبال کے لئے تیار تھا۔ ملازم گنیش بھی اپنے مالک کے نفیس ترین کپڑے پہنے اس موقعہ کے لئے تیار کھڑا تھا۔

جب چھوٹے لاٹ صاحب کے آنے کا اعلان ہوا۔ تو لرزاں و ترساں ہونکتے ہوئے دروازے تک دوڑ کر آئے۔ اور بار بار سلام بجا لا کر میرے ایک دوست کو جس نے لاٹ صاحب کا بھیس بدلا ہوا تھا۔ استقبال کر کے اندر لائے۔ ہر ایک سیڑھی پر جھک جھک کر سلام کرتے۔ اور اسی انداز سے واپس آئے لکڑی کی ایک کرسی پر اپنے آباؤ اجداد کا خاندانی دوشالا بچھا رکھا تھا۔ اور لاٹ صاحب سے درخواست کی کہ تشریف رکھیں۔ جب یہ ہو چکا۔ تو کالی بابو نے

اُردو زبان میں جو صاحب لوگوں کی قدیمی درباں سے ایک برجستہ تقریر کی سونے کی طشتری پر اشرفیوں کی لڑی رکھ کر بطور نذرانہ پیش کی یہ اشیاء اسکے بزرگوں کی بچت کمچت تھیں۔
گنیش داس جسکے چہرے پر خوف وہراس نمایاں تھا۔ گلاب دانی ہاتھ میں لئے ہوئے تپیچھے کھڑا تھا۔ اس نے گلاب چھڑکا۔ کہ لاٹ صاحب تربتر ہو گئے اور عطر دانی میں سے بار بار ان کے کپڑے معطر کرتا جاتا تھا
کالی بابو نے افسوس سے کہا ”میں حضور کا استقبال اپنے خاندان کی پرانی روایات اور شان کے مطابق کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ اگر حضور کا مشرف ملاقات نامیجور میں حاصل ہوتا تو میں یقیناً پوری کرّو فر سے حضور کا استقبال بجالاتا مگر کلکتہ میں میں ایک اجنبی شخص ہوں۔ یہاں تو بعینہٖ ایسی حالت ہے جیسا کہ ایک مچھلی کی حالت پانی سے باہر ہوتی ہے۔“
میرے دوست نے جو سر پر بلند ریشمی انگریزی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انہیں انگریزی رواج کے مطابق کمرے کے اندر داخل ہوتے وقت ٹوپی اُتار کر رکھ دینی چاہیئے تھی۔ مگر دوست ایسا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اور مبادا بھانڈا پھوٹ جائے۔ اور ملاقات کی رسم کی یہ خلاف ورزی کالی بابو اور گنیش کے تو خواب وخیال میں کبھی بھی

نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے خیالات کی بلند پرواز ی بھلا ادھر کیسے راغب ہو سکتی تھی۔ دس منٹ کی ملاقات کے بعد جس کے دوران میں میرا دوست یعنی فرضی لاٹ صاحب صرف سر ہلاتا رہا۔ وہ چلنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ جیسا کہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ دونوں باوردی پیادے اشرفیوں کی لڑی۔ سونے کی طشتری۔ خاندان کا پرانا دوشالہ چاندی کا گلاب دان اور عطر دان اکٹھا کرے گئے۔ اور بڑے تکلف طریق سے گاڑی میں رکھ دیئے۔ کالی بابو نے خیال کیا۔ کہ چھوٹے لاٹ صاحب کا ایسا ہی دستور ہوتا ہے۔

ساتھ کے کمرے میں سے میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ہنسی کو روک رکھنے کی وجہ سے میری پسلیوں میں درد ہو رہا تھا۔ جب مجھ میں زیادہ ضبط کی طاقت نہ رہی تو میں اس سے اگلے کمرے میں بھاگ گیا۔ اور اچانک دیکھا کہ ایک کونے میں کھڑی ایک لڑکی ہچکیاں سے لے کر رو رہی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کے دل کو کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ جب اس نے مجھے بلند آواز سے ہنستے دیکھا تو گھبرا کر وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی روشنی نکل کر میری آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ آخر آنسوؤں سے رکی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرے بابا جی نے تمہیں کیا نقصان پہنچایا ہے۔ تم کیوں انہیں دھوکہ دینے آئے ہو یہاں کس غرض سے آئے ہو؟"

اس سے زیادہ وہ بول نہ سکی۔ اور ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر پھر رونے لگ پڑی۔

یہ دیکھ کر میری ہنسی جھٹ رک پڑی۔ مجھے یہ کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ جو کچھ میں نے کیا تھا۔ وہ ایک نہایت مزیدار مذاق سے زیادہ ہے۔ مگر اب مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اس معصوم لڑکی کے ٹھیس لگائی ہے۔ اور تکلیف پہنچائی ہے۔ میرا یہ ظالمانہ فعل مجھے بھدی سے بھدی شکل میں دکھائی دینے لگا۔ اور زبان حال سے پکار اٹھا کہ میں مجرم ہوں اب تک کالی بابو کی پوتی کسم کے متعلق اگر میرے دل میں کوئی خیال تھا۔ تو وہ یہ تھا۔ کہ شادی کے بازار میں اس کا کوئی خریدار نہیں ہے اور کہ اس کے لئے خاوند کی تلاش فضول ہے۔ مگر اب مجھے دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ اسی کمرے کے کونے میں ایک انسانی دل حرکت کر رہا ہے۔

تمام رات مجھے بہت کم نیند آئی میرے دل کے اندر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اگلے روز علی الصبح ہی تمام مال مسروقہ لیکر میں کالی بابو کی جائے رہائش کی جانب روانہ ہو گیا۔ تاکہ پوشیدہ طور سے سب کچھ گنیش کے حوالہ کر دوں۔ دروازے کے باہر میں نے کچھ عرصہ انتظار کی۔ مگر جب کوئی نظر نہ پڑا۔ تو کالی بابو کے کمرے میں جانے کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ دروازے کے باہر میرے کان میں آواز پڑی۔ کہ کسم اپنے دادا سے یوں سوال کر رہی ہے۔

"دادا چھوٹے لاٹ صاحب نے کل جو کچھ تمہیں کہا ہے مجھے بتاؤ۔ ایک ایک لفظ بتاؤ۔ میں یہ تمام حال سُننے کی از حد مشتاق ہوں"

کالی بابو کو مزید اکساوٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ فخر سے تمتما رہا تھا۔ جب اس نے تمام تعریفی کلمات جو لاٹ صاحب نے نامنجور کے قدیمی خاندان کی بابت کہے تھے سُنائے۔ لڑکی اس کے سامنے بیٹھی اس کے منہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور ہر ایک لفظ پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ دادا کے لیئے جو اسے محبت تھی، وہ تقاضا کرتی تھی۔ کہ وہ اپنا پارٹ اس انداز سے ادا کرے کہ اس کے دادا کے دل میں کوئی شک نہ اُٹھنے پائے۔

میرا دل متاثر ہوا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے جب ٹھاکر دادا چھوٹے لاٹ صاحب کی آمد اور عجیب و غریب ملاقات کے متعلق اپنا بیان ختم کر چکا۔ تو میں ابھی باہر کھڑا تھا۔ آخر جب کالی بابو کمرے سے چلا گیا تو اندر جا کر میں نے تمام مسروقہ مال لڑکی کے قدموں پر رکھ دیا۔ اور بغیر کوئی بات کہے باہر چلا آیا۔

کچھ گھڑی دن گئے میں پھر ملنے آیا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں یہ برا رواج ہے میری عادت تھی کہ جب اس ضعیف شخص کے کمرے میں داخل ہوتا تو کوئی سلام۔ بندگی نہیں کیا کرتا تھا۔ مگر آج جھک کر میں نے نمسکار کیا اور چرن چھوئے مجھے یقین ہے۔ کہ کالی بابو نے خیال کیا ہوگا کہ میری نئی خوش خلقی کا باعث چھوٹے لاٹ صاحب کی ملاقات ہے۔ وہ میرے

منسہ کار کرنے سے بہت خوش ہوا، اور اس کی آنکھوں میں ایک قسم کا جلال ٹپک رہا تھا۔ اس کے چند دوست آئے ہوئے تھے۔ اور لفٹیننٹ گورنر کی آمد کا قصہ پہلے سے بھی زیادہ حاشیہ آرائی اور تفصیل کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس ملاقات کی کہانی پہلے ہی کیا بلحاظ نوعیت اور کیا بلحاظ طوالت رزمیہ کہانی بنتی شروع ہو گئی تھی۔

جب باقی سب کے تمام ملاقاتی چل دیئے۔ تو میں نے بدیں الفاظ نہایت عاجزی سے اپنی شادی کے متعلق ارادہ اظہار کیا۔

"اگرچہ میں ایک منٹ کے لئے بھی یہ امید نہیں کر سکتا کہ میں بذریعہ شادی ایسے عالی خاندان سے رشتہ جوڑ سکوں۔ پھر بھی . . . . "

جب میں نے اپنا مطلب صاف صاف بیان کیا تو بوڑھا مجھ سے بغلگیر ہوا اور فرط انبساط کی حالت میں بولا۔

میں تو ایک غریب شخص ہوں مجھے امید نہیں تھی۔ کہ میری قسمت ایسی اچھی ہے۔"

کالی بابو کی زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقعہ تھا۔ کہ اس نے اپنی مفلسی کا اقبال کیا۔ اور یہی اس کی زندگی کا پہلا اور آخری موقعہ تھا۔ کہ جب اس نے نائینجور کے بابوؤں کی جاہ و حشمت بھلا دی خواہ صرف ایک لمحہ کے لئے ہی

بیوہ

(۱)

میری پڑوسن لڑکپن ہی میں بیوہ ہوگئی۔ وہ گویا پالے کی ماری ہوئی ایک ناشگفتہ کلی تھی جو اپنی شاخ سے جُدا ہو چکی ہو۔ میں دل ہی دل میں اسکی پوجا کرتا تھا۔ اسکے سوا میں اسے اور کسی نظر سے دیکھتا تھا۔ یا نہیں! یہ بتانے کی نہ میری خواہش ہے اور نہ اسکی ضرورت،

میرے راز سے میرا دلی دوست نوین مادھو بھی ناواقف تھا۔ اور مجھے اس رازداری پر فخر تھا لیکن دلی جذبات اس پہاڑی چشمہ کے مثل ہوتے ہیں۔ جو کسی نہ کسی طریقہ پر قابو سے باہر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر اس میں ناکامیاب رہتا ہے تو سخت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے ارادہ کیا کہ اپنے تاثراتِ قلبی کو نظم کا جامہ

پھنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرے۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا۔ کہ نوین مادھو کو بھی شاعری سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی جس طرح لوری زلزلہ آتا ہے تو انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اسیطرح مادھو کی طبیعت میں یہ انقلاب عظیم دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا۔ وہ شاعری سے محض نابلد تھا۔ ردیف قافیہ۔ بحر۔ وزن، سب سے ناواقف پھر بھی اس نے بلا تکلیف طبع آزمائی کی اور مدد کے لئے میرا دامنگیر ہوا۔

میں نے اس کی ایک نظم دیکھی جو نہ قدیم طرز پر ہی لکھی گئی تھی۔ اور نہ جدید رنگ ہی میں تھی شروع سے لیکر آخر تک محبت کا افسانہ تھا۔

میں نے ہنس کر پوچھا۔ کیوں دوست تمہارا مخاطب کون ہے؟ لیکن مادھو نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں خود ابتک اس سے ناواقف ہوں "

مادھو کی نظموں کی نظرثانی کرنے میں مجھے بھی دلی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ میں اسکی نظموں میں اپنے واردات قلبی کو بیان کرنے لگا۔ جسطرح کوئی مرغی ہنس کا انڈا پاکر اسے اپنے کلیجہ سے لگا کر بیٹھ جاتی ہے اسی طرح میں بھی مادھو کے خیالات کو اپنے دلی جذبات کے تہ میں دبا بیٹھتا۔ مادھو کی تک بندیوں پر میں اس طرح اصلاح دیتا کہ قریباً ساری نظم میرے ہی خیالات کا آئینہ بن جاتی۔ مادھو خوش ہو کر

کہتا " بس بس میں بھی یہی باتیں نظم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا تم نے میرے دل کی باتیں لکھ دی ہیں۔ خدا جانے تم کو میرے دلی جذبات کا کیسے اندازہ ہو جاتا ہے "

میں بڑی متانت سے مشہور شعرا کی طرح جواب دیتا۔ یہ قوت خیال کا کرشمہ ہے اور درحقیقت خیالات تو سب تمہارے ہی ہیں میں تو صرف چند الفاظ گھٹا بڑھا دیتا ہوں "

پہلے تو مادہو کو میری باتوں پر یقین نہ آتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی سوچنے لگا اور اسکے اس مغالطہ نے یقین کی صورت اختیار کر لی۔

میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ جس طرح کوئی جوتشی نچھتر کا پتہ لگاتے وقت آسمان کیطرف دیکھنے لگتا ہے۔ اسی طرح میں بھی گاہے ماہے اپنے ہمسایہ کی کھڑکی کیطرف تاکنے لگتا تھا۔ اور وہاں اکثر میرا گوہر مقصود نظر آجاتا تھا۔

(۲)

بیساکھ کا مہینہ اور سہ پہر کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس وقت میری پڑوسن کھڑکی میں اکیلی کھڑی تھی۔ میں نے اس دن اس کی آنکھوں میں انتہائی رنج و غم کے آثار دیکھے اسکی بڑی بڑی چنچل آنکھیں آندھی سے گھبرائے ہوئے پرندہ کی طرح پریشان تھیں اور وہ کسی خیال میں کھوئی ہوئی سی نظر آتی تھی۔ اس وقت سے میرے لئے اپنے دل کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اب صرف

شاعری ہی سے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوتا تھا۔ بلکہ وحشتِ قلب کا کچھ اَور ہی تقاضہ تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ بنگال میں ایسا پراپیگنڈا کروں کہ بیوا‌ؤں کی شادی میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ جائے۔ اس کام میں چاہے میری جان ہی کیوں نہ جاتی رہے۔ میں کسی کی مخالفت کی پروانہ کروں گا۔ اس معاملہ میں مادھو مجھ سے بحث کرنے لگا۔

اُس نے کہا: "بیوگی میں ایک قسم کی پاک روحانیت کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے شادی سے یہ پاکیزگی اَور روحانیت جاتی رہتی ہے۔"

اس فضول اور شاعرانہ گفتگو سے مجھے طیش آگیا۔ اَور میں نے کہا کہ قحط کے دنوں میں جو شخص بھوکوں مر رہا ہو۔ اس کے سامنے کھانے کی چیزوں کی بُرائی کرنا اَور پھولوں کی خوشبو اَور چڑیوں کے گانے سے اس کا پیٹ بھرنے کی کوشش کرنا حماقت نہیں تو اَور کیا ہے۔ مصوّروں کی نگاہ میں آرٹ کے لحاظ سے جلے ہوئے مکان میں ایک خاص قسم کی خوبصورتی آجاتی ہے۔ لیکن مکان کو مصوّر کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس میں رہنا بھی پڑتا ہے چنانچہ مصوّر چاہے کچھ ہی کیوں نہ کہے لیکن مکان کی مرمت کرانا ضروری ہے۔ تم تو بیوا‌ؤں پر کسی اور خیال سے شاعرانہ محبت کرنا چاہتے ہو لیکن تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ بیوا‌ؤں کے سینوں میں بھی حسرت نصیب اَور غمزدہ دل ہوتے ہیں"؟

مادھو نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر میری بات مان لی۔

(۳۳)

ایک ہفتہ کے بعد اس نے مجھ سے آکر کہا "اگر تم میری مدد کرو تو میں کسی بیوہ کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں"

یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے مادھو کو گلے سے لگا کر کہا "اس کام میں تم کو جو کچھ صرف کرنا پڑے گا۔ وہ میں اپنے پاس سے دوں گا۔

مادھو نے اپنی ساری سرگذشت سنا دی۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ کچھ عرصہ سے ایک بیوہ سے محبت کرنے لگا ہے یہ بات اس نے ابتک کسی پر ظاہر نہ کی تھی۔ جن ماہوار رسائل میں مادھو کے نام سے میری نظمیں شایع ہوئی تھیں۔ وہ منزل مقصود تک پہنچا دیے جاتے تھے۔ ان نظموں کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ گویا کسی تحریک کی ضرورت ہی نہ ہوئی بلکہ اپنی طرف دل کھینچنے کا خود بخود ایک طریقہ نکل آیا۔ مادھو نے مجھے اطمینان دلایا۔ کہ اسکی یہ کارروائی کسی چالاکی پر مبنی نہ تھی۔ کیونکہ اس کے خیال سے وہ منظور نظر بیوہ پڑھی لکھی بھی نہ تھی۔ بیوہ کے بھائی کے نام سے وہ رسالہ کی ایک کاپی بلا قیمت ہر مہینہ بھیج دیا کرتا تھا۔ گو یہ دیوانگی تھی مگر اس طرح دل کو کچھ نہ کچھ اطمینان ہو جاتا تھا۔ اور مادھو اپنے دل کو یہ سمجھا لیا کرتا تھا۔ کہ اس نے دیوتا کے نام پر جل اور پھول چڑھا دیئے۔ اسکو خبر ہو یا نہ ہو۔ وہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ بیوہ کے بھائی سے مادھو نے جو دوستی پیدا کر لی تھی، اس میں بھی

بقول اسکے کوئی خاص مقصد نہ تھا جسکو کوئی پیار کرتا ہے اسکے قریب رہنے والوں کے ساتھ بھی قدرتاً محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ بھائی کی سخت بیماری میں اس کی بہن سے مادھو کی کس طرح ملاقات ہوئی یہ ایک طولانی داستان ہے۔ پہلے تو وہ بیوہ شادی کرنے پر راضی نہ ہوئی لیکن جب مادھو نے اپنی زوردار دلیلیں پیش کر کے آنکھوں سے آنسو بہائے۔ تو وہ مان گئی۔

مادھو نے کہا کہ "اب اس بیوہ کے عزیز شادی کے خرچ کیلئے کچھ روپیہ مانگتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا۔ اسکی تم فکر نہ کرو۔ میں اسی وقت روپیہ دینے کو تیار ہوں۔"

مادھو نے کہا "شادی کے بعد میرے والد پانچ چھ مہینے کے لئے میرا خرچ ضرور بند کر دینگے۔ اس عرصہ کیلئے بھی تم کو ہم دونوں کے خرچ کا بندوبست کرنا پڑیگا۔"

میں نے بغیر کچھ کہے سنے مادھو کے نام ایک چیک کاٹ دیا۔ اور کہا "بھائی اب تو اپنی منظور نظر کا پتہ ٹھکانا بتادو کچھ خوف نہ کرو۔ میں تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب اسکے پاس بھیجنے کے بجائے تمہارے پاس بھیجدیا کروں گا۔

مادھو نے۔ ابھی میں اس سے نہیں ڈرتا۔ دوبارہ شادی سے وہ خود بہت پریشان ہے۔ اسی وجہ سے اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں

تم سے اس کا حال بیان نہ کروں لیکن میرے خیال میں اب چھپانا بیکار ہے وہ تمہاری ہی پڑوسن ہے جو ۱۹ نمبر والے مکان میں رہتی ہے "

اگر میرا دل لوہے کا بوائلر بھی ہوتا تو یقیناً اس چوٹ سے پھٹ جاتا بڑی مشکل سے کچھ دیر بعد جب میری طبیعت سنبھلی تو میں نے دریافت کیا "کیا وہ شادی بیوگان پسند کرتی ہے"؟

مادھو نے ہنس کر جواب دیا "ہاں اس وقت تو پسند کرتی ہے"

میں نے کہا "کیا صرف نظم پڑھ کر ہی وہ تم پر فریفتہ ہو گئی؟"

مادھو بولا "کیوں اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ کیا میری نظمیں کچھ معمولی ہوا کرتی تھیں۔

اسکے آگے میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔ "بکف چراغ داشتن" کی اس سے بڑی مثال کب کسی کے دیکھنے میں آئی ہوگی؟

بھوکے پتھر

(۱)

میں اپنے ایک رشتہ دار کے ہمراہ پوجا کے سفر سے کلکتہ واپس آرہا تھا اسی ٹرین میں ہمیں وہ آدمی ملا۔ اسکے لباس اور وضع قطع سے پہلے تو ہم نے اُسے بالائی حصہ ملک کا باشندہ خیال کیا۔ لیکن جب ہم نے اُسے باتیں کرتے سُنا تو متحیر ہو گئے ہر ایک عنوان پر وہ اتنے وثوق کیساتھ گفتگو کرتا تھا۔ کہ بے اختیار یہ گمان ہوتا گویا کارخانہ عالم کا انتظام کرنیوالا خدا جو کچھ کرتا ہے ہمیشہ اسی سے مشورہ کے بعد کرتا ہے۔ ابتک ہم مکمل طور پر مسرور رہتے کیونکہ کسی نے ہمیں یہ نہ بتلایا تھا۔ کہ دنیا میں بعض پوشیدہ اور نامعلوم قوتیں بھی کارفرما ہیں۔ لیکن یہ ہمارا نیا دوست ایک پُر معنی تبسم کیساتھ کہنے لگا۔ تمہارے اخبار جتنی اطلاعات ہم پہنچاتے ہیں اس زمین و آسمان

میں ان سے کہیں زیادہ واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں چونکہ ہم اس سے پیشتر کبھی گھر سے نہ نکلے تھے اسلئے اس شخص کے اطوار نے ہمیں محو حیرت کر دیا۔ خواہ موضوع کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ وہ اس پر سائنس کے حوالے دیتا یا ویدوں کا ذکر کرتا۔ یا پھر کسی فارسی شاعر کی رباعیات پڑھنے لگتا۔ اور چونکہ ہمیں سائنس یا ویدوں یا فارسی زبان سے واقف ہونے کا کوئی خود فریب احساس نہ تھا۔ اسلئے اس شخص کیلئے ہمارا جذبۂ تحسین بڑھتا چلا گیا۔ اور میرے رشتہ دار کو جو تھیوسافسٹ خیالات کا معتقد تھا۔ پوری طرح یقین ہو گیا۔ کہ ہمارا یہ ہمسفر ضرور کسی "مقناطیسیت" یا کسی مخصوص "جرم فلکی" یا کسی مخفی طاقت یا دوسرے مافوق الفطرت اثرات کے تحت میں ہے۔ ہمارے اس غیر معمولی ساتھی کی زبان سے جو پامال سے پامال بات نکلتی میرا رشتہ دار اُسے ایک پرستانہ محویت کے ساتھ سنتا اور اسکی گفتگو کی بابت، پوشیدہ طور پر کچھ یادداشت درج کرتا جاتا۔ میرا خیال ہے کہ بات اس غیر معمولی آدمی نے بھی دیکھ لی تھی۔ اور اس کی بناء پر کچھ مسرور رہتا۔

جب ٹرین جنکشن پر پہنچی اور ہم گاڑی بدلنے کیلئے ویٹنگ روم میں جمع ہوئے۔ تو اسوقت رات کے دس بجے تھے۔ اور چونکہ ٹرین ریلوے لائن کی خرابی کے باعث لیٹ تھی۔ میں نے اپنا بستر میز پر بچھا لیا۔ اور ایک راحت انگیز غنودگی کے لئے تیار ہی ہو رہا تھا۔ کہ یکایک اس غیر معمولی شخص نے ارادی طور پر مندرجہ ذیل کہانی بیان کرنی شروع کر دی۔

اس رات پھر مجھے بالکل نیند نہ آسکی۔

(۴)

جب انتظامی حکمت عملی کے چند سوالات پر اختلاف رائے پیدا ہونے کی وجہ سے میں نے جوناگڑھ میں اپنی ملازمت چھوڑ دی تو اعلیٰ حضرت نظام کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ اور چونکہ میں ایک طاقتور نوجوان تھا اس لیئے مجھے بریچ کے مقام پر کپاس کے محصول کا کلکٹر مقرر کیا گیا۔

بریچ ایک خوبصورت جگہ ہے شسشہ ندی سنگین راستوں پر گنگناتی اور چھوٹے چھوٹے پتھروں پر حباب پیدا کرتی ہوئی سنسان پہاڑیوں کے دامن میں جنگلات کے درمیان ایک ماہر رقاصہ کیطرح خراماں خراماں بہتی چلی گئی ہے۔ ندی کی سطح سے کنارے کی بلندی تک ڈیڑھ سو سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور ان سیڑھیوں کے اوپر ساحل کے پاس اور پہاڑیوں کے دامن میں سنگ مرمر کا ایک ویران محل ایستادہ ہے۔ اس محل کے چاروں طرف انسانوں کی کوئی آبادی نہیں۔

تقریباً ڈھائی سو برس گذرے کہ شہنشاہ محمود ثانی نے یہ محل اپنے عیش و نشاط کیلئے تعمیر کرایا تھا۔ اسکے زمانہ حیات میں اس محل کے فواروں سے گلاب کے عرق کی پھواریں اُبلتی تھیں۔ اور اس کے فرحت ناک کمروں کے سرد مرمریں فرش پر نوجوان ایرانی لڑکیاں بیٹھی رہتی تھیں غسل سے پہلے وہ اپنے لمبے بالوں کو کھولے ہوئے حوضوں کے شفاف پانی میں اپنے گداز برہنہ پاؤں کو ہلا ہلا کر رباب کی

چھند کار کے ساتھ اپنے ناک تانوں کی غزلیں گایا کرتی تھیں۔
فوارے اب نہیں اُبلتے نغمے بند ہو چکے ہیں اور برف جیسے سفید پاؤں بھی اب اس محل کے مرمریں فرش پر حسن داد کیساتھ اٹھتے نظر نہیں آتے اب تو وہاں ہم جیسے محصول وصول کرنیوالوں کے کوارٹر ہیں۔ جو تنہائی کے بوجھ میں دبے ہوئے اور عورتوں کی معیت سے محروم رہ کر بھی وہاں پڑے رہتے ہیں میرے دفتر کے بوڑھے محرر کریم خاں نے مجھے متعدد بار متنبہ کیا کہ میں وہاں اقامت اختیار نہ کروں اس نے کہا اگر آپ چاہیں تو دن کا وقت گذار سکتے ہیں لیکن رات کو ٹھیرنے کا کبھی خیال بھی نہ کیجئے گا۔ میں نے ایک ہلکی ہنسی کیساتھ اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ ملازموں نے کہا کہ اندھیرا ہونے کے بعد وہاں چور بھی آنے کی ہمت نہ کرتے تھے شروع شروع میں اس اُجاڑ مقام کی تنہائی ایک ڈراونے خواب کی طرح مجھے اپنے بوجھ کے نیچے دبانے لگی۔ یہ بیان کرنا مشکل ہے اور لوگوں کو بھی اس کا یقین دلانا دشوار مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا پوری عمارت ایک زندہ مخلوق ہے جو اپنے معدہ کے کسی بیہوش کن عرق کے عمل سے مجھے آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طریقہ پر ہضم کرتی جارہی ہے۔
شاید یہ عمل اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ میں نے عمارت میں قدم رکھا۔ لیکن مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ جب مجھے اس کا احساس ہوا۔

موسم گرما کا آغاز تھا۔ اور بازار میں کاروبار کی کمی کی وجہ سے مجھے کوئی کام نہ تھا۔ غروب آفتاب سے کچھ ہی پیشتر میں ندی کی سطح کے قریب سیڑھیوں کے نیچے ایک آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ شستہ ندی کا پانی سمٹ کر نیچا ہو گیا تھا۔ دوسرے کنارے پر ریت کا ایک چوڑا ٹیلا شام کی رنگینیوں سے چمک رہا تھا۔ میری طرف کے کنارے پر صاف و پایاب پانی کی تہ میں پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چمک اٹھتے تھے۔ کسی جگہ ہوا کی ہلکی سی بھی رمق موجود نہ تھی۔ اور ساکت ہوا قریبی پہاڑیوں کی خوشبودار جھاڑیوں کی مہک سے لدی ہوئی تھی۔

جیسے ہی کوہستانی چوٹیوں کے پیچھے سورج غروب ہوا دن کے منظر پر ایک لمبا سیاہ پردہ گر گیا۔ اور پہاڑیوں نے درمیان میں حائل ہو کر اس نت کو مختصر کر دیا۔ جب کہ غروب آفتاب تاریکی اور روشنی کو باہم آمیز کرتا ہے میں نے سوچا کہ گھوڑے کی سواری کیلئے چلوں اور یہ سوچکر اٹھنے والا ہی تھا۔ کہ یکایک مجھے اپنے پیچھے سیڑھیوں کے اوپر قدم کی ایک چاپ سنائی دی۔

میں اسکو اپنے وہم کا فریب سمجھ کر بیٹھا ہی تھا۔ کہ مجھے بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور ایسا محسوس ہوا گویا بہت سے آدمی تیزی کے ساتھ سیڑھیوں سے اتر رہے ہیں۔ مسرت کی ایک عجیب کپکپی جس میں کچھ خوف بھی شامل تھا میرے جسم میں دوڑ گئی اور اگرچہ میری آنکھوں کے سامنے ایک بھی متنفس نہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا گویا میں بشاش لڑکیوں

کا ایک غول دیکھ رہا ہوں۔ جو شام گرما میں ندی کے اندر غسل کرنے کیلئے سبز میوں سے نیچے آ رہی ہیں کوہستانی وادی میں ندی میں بالکل کے اندر خاموشی کو توڑنے والی ایک بھی آواز موجود نہ تھی لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لڑکیاں شوخی کے ساتھ ایک دوسرے کے تیز تعاقب میں میرے نزدیک سے ہوتی ہوئی ندی کیطرف بھاگی جا رہی ہیں اور مسرور و مترنم قہقہے بلند کرتی جاتی ہیں۔ مگر مجھے بالکل نہیں دیکھ سکتیں جس طرح وہ میرے لئے غیر واضح اور مرئی تھیں۔ اسی طرح میں بھی ان سے مخفی تھا۔ ندی کا پانی پوری طرح ساکن اور پُرسکون تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ ساکت و پایاب لیکن شفاف پانی یکایک بہت سے ایسے انسانی بازوؤں کی جنبش سے متحرک ہو گیا۔ جنکی مترنم چوڑیاں چھن چھن کر رہی تھیں۔ اور ایک دوسرے پر پانی اچھال رہی تھیں خوبصورت تیرنے والیوں کے پاؤں ننھی ننھی لہروں کو اچھال کر موتیوں کی بوچھاڑ کرتے معلوم ہوتے تھے۔

میں نے اپنے دل میں ایک تھرتھری محسوس کی یہ بتانا مشکل ہے کہ میری یہ حسیاتی بیداری خوف کیوجہ سے تھی۔ یا مسرت کیوجہ سے یا تجسس کی بنا پر میرے دل میں یہ زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ ان لڑکیوں کو اور زیادہ صاف طور پر دیکھوں لیکن میری نظر دل کے سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ مجھ کو خیال آیا کہ اگر میری سماعت ذرا سی کوشش کرے تو انکی باتیں سن لیگی لیکن انتہائی کوشش کے باوجود میں جنگل میں بولنے والے جھینگروں کی آواز کے سوا اور کچھ نہ سن سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ڈھائی سو

سال کا ایک سیاہ پردہ میرے سامنے لٹک رہا ہے۔ اور اگرچہ میں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا ایک گوشہ اُٹھا کر بخوبی اندر جھانک سکتا ہوں تاہم پردے کے اُس پار لڑکیوں کی یہ جماعت مکمل طور پر تاریکی میں ملفوف ہے۔

یکایک ہوا کے جھونکے سے شام کا تکلیف انگیز حبس دُور ہو گیا اور ندی کی سطح سمندری پری کے بالوں کی طرح لہرانے اور بل کھانے لگی۔ شام کی تاریکی میں لپٹے ہوئے جنگلوں سے سرسراہٹ کی ایسی آواز آنی شروع ہوئی گویا وہ کسی تاریک خواب سے بیدار ہو رہے تھے آپ اسے حقیقت سمجھیں یا محض ایک خواب کہ اس غیر مرئی سراب کی یہ عارضی جھلک جو دُور اُفتادہ ڈھائی سو سال پُرانی دنیا سے متعلق تھی۔ ایک ساعت میں غائب ہو گئی۔ وہ پُراسرار شکلیں جو اپنے غیر جسمانی سبک قدموں اور بے آواز بلند قہقہوں کیساتھ میرے پاس سے ہو کر گئی اور ندی میں داخل ہوئی تھیں اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کو نچوڑتی ہوئی واپس نہ گئیں بہار کے صرف ایک سانس نے ان کو ہوا میں پھیلی ہوئی خوشبو کی طرح منتشر کر دیا۔

اس وقت میرے دل میں یہ ہراس پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ خود میرے واہمہ کا کرشمہ ہے جس نے میری تنہائی سے فائدہ اُٹھا کر مجھ پہ غلبہ حاصل کر لیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اچھا کھانا کھایا جائے۔ کیونکہ خالی معدہ ہی وہ شے ہے جس کو تمام قسم کی بیماریاں آسانی سے شکار کر لیتی ہیں میں نے

اپنے باورچی کو بلایا۔ اور حکم دیا۔ کہ ایک پُرتکلف اور نفیس مغلئی طعام تیار کیا جائے جو گھی اور مختلف مصالحوں سے معطر ہو۔

(۳۱)

اگلے دن صبح کو یہ سارا معاملہ ایک عجیب وہم و خیال معلوم ہوتا تھا دل کی بےفکری کیسا تھ میں نے ایک سولا ہیٹ پہنا اور گاڑی پر بیٹھ کر اپنے کام کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس روز مجھے اپنی سہ ماہی رپورٹ لکھنی تھی۔ اور دیر میں واپس آنے کی اُمید تھی لیکن شام ہونے سے پہلے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز مکان کیطرف مجھے کھینچ رہی ہے۔ وہ چیز کیا تھی یہ میں نہیں بتا سکتا۔ بس یہ محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہاں سب میرا انتظار کر رہی ہیں اور مجھے اب زیادہ دیر نہ کرنا چاہیئے۔ اپنی رپورٹ کرنا مکمل چھوڑ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور تاریک سایہ دار سنسان راستے کو اپنی گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ سے چونکاتا ہوا اس محل کے پاس پہنچ گیا۔ جو پہاڑیوں کے تاریک دامن میں استادہ تھا۔

پہلی منزل کا زینہ ایک کشادہ ہال تک جاتا تھا۔ اسکی وسیع چھت مرصع محرابوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ جو بڑے بڑے ستونوں کی تین قطاروں پر قائم تھیں۔ سب در و دیوار اپنی شدید ویرانی کے بوجھ سے رات دن کراہتے معلوم ہوتے تھے۔ دن ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ لیکن چراغ روشن نہ ہوئے تھے۔ جیسے ہی میں نے دھکا دیکر دروازہ کھولا کمرے کے اندر ایک زبردست گڑبڑ سی شروع ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا لوگوں کا ایک مجمع گھبراہٹ

کہ سارا منتشر ہو رہا ہے۔ اور سب آدمی عجلت کے ساتھ فرار ہونے کیلئے دروازوں دریچوں غلام گردشوں برآمدوں، اور کمروں کے درمیان سے لپک رہے ہیں۔

چونکہ مجھے کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے متحیر ہو کر کھڑا رہ گیا، اور ایک قسم کی بے اندازہ مسرت کے عالم میں میرا ایک ایک بال کھڑا ہو گیا، عطر کی سی ہلکی مہک جو گذرے ہوئے زمانہ کے اثرات سے بسی تھی میری ناک میں پہنچی، اس ویران و وسیع ہال کے اندر ان قدیم ستونوں کی قطاروں کے درمیان کھڑے ہو کر سننے لگا۔ سنگ مرمر کے فرش پر فواروں کے گرنے کی آواز رباب پر بجتا ہوا ایک عجیب متفرق نغمات کی جھنکار اور چوڑیوں کا دھیما ترنم وقت بتانے والی گھنٹیوں کی ٹن ٹن دور بجنے والی نوبت کی آواز ہلکی ہوا کی موجوں میں جھاڑ فانوس کے بلوری ٹکڑوں کا ہل ہل کر بجنا۔ غلام گردشوں میں لٹکے ہوئے پنجروں میں بلبلوں کی نغمہ خوانی باغوں میں سازوں کی آواز یہ سب کچھ مل جل کر میرے چاروں طرف غیر ارادی موسیقی پیدا کر رہے تھے۔

اور پھر میں کچھ ایسا مسحور ہو گیا۔ کہ یہ غیر محسوس غیر ارادی اور غیر الحصول نظارہ ہی دنیا میں واحد حقیقت معلوم ہونے لگا۔ اور باقی سب کچھ محض ایک خواب یہ خیال کہ میں ایک محصول کلکٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیکر ساڑھے چار سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ حاصل کر رہا ہوں۔ اور ہر روز اپنا چھوڑا کوٹ اور سولا ہیٹ پہن کر گاڑی میں جاتا ہوں، یہ خیال

اب اتنی حیرتناک حد تک مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا۔ کہ میں نے اس وسیع اور خاموش ہال میں کھڑے ہو کر بے اختیار ایک گلوگیر قہقہہ بلند کیا۔

ٹھیک اسی وقت میرا ملازم اپنے ہاتھ میں گیس کا روشن لیمپ لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ مجھے علم نہیں کہ اس نے مجھے پاگل سمجھا یا نہیں لیکن مجھے یاد آگیا کہ میں کون ہوں اور اگرچہ محض ہمارے چھوٹے اور بڑے شاعر یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اس زمین کے اندر یا باہر کوئی ایسا خطہ ہے جہاں غیر مرئی فوارے ابدی طور پر اُبلتے رہتے ہیں اور پریوں کے رباب غیر مرئی انگلیوں کی لمس سے ایک ابدی موسیقی پیدا کرتے ہیں۔ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ میں بربیچ کے اندر میں کپاس کا محصول وصول کرتا اور اس طرح ساڑھے چار سو روپے سالانہ تنخواہ حاصل کرتا تھا۔

میں اپنے واہمہ کے اس عجیب فریب پر خوب ہنسا اور اپنی سفری میز کے پاس گیس کے لیمپ کی روشنی میں اخبار پڑھنے بیٹھ گیا۔

جب میں اخبار پڑھ چکا اور اپنا مغلئی طعام کھا چکا تو میں نے لیمپ کو گل کر دیا۔ اور ایک چھوٹے سے ملحقہ کمرے میں اپنے بستر پر لیٹ گیا کھلی ہوئی کھڑکی میں سے پہاڑیوں کے بہت اوپر جو کہ اس وقت جنگلات کے اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھیں ایک چمکدار ستارہ آسمان میں لاکھوں میل کے فاصلہ سے اپنی نظریں ایک حقیر سی سفری چارپائی پر لیٹے ہوئے آدمی پر غور سے جمائے ہوئے تھا۔ مجھے اپنے اس خیال سے تعجب اور دلچسپی محسوس ہوئی۔ اور میں نہیں جانتا کہ کب سو گیا یا کتنی دیر تک

سوتا رہا۔ یکایک میں چونک کر جاگ اٹھا۔ حالانکہ میں نے نہ کوئی آواز سنی اور نہ کسی کو دیکھا۔ وہ مستقل مزاج اور روشن ستارہ جو پہاڑ کی چوٹی پر چمک رہا تھا۔ اب ڈوب چکا تھا۔ اور نئے چاند کی روشنی کمرے میں اس طرح چپ چاپ داخل ہو رہی تھی۔ گویا اپنی مداخلت پر شرمندہ ہے میں نے کسی کو نہیں دیکھا لیکن محسوس کیا گویا مجھے کوئی نرمی کے ساتھ دھکیل رہا ہے وہ کوئی عورت تھی۔ جب میں جاگ گیا تو بھی وہ نہ بولی البتہ اپنی نازک انگلیوں سے جو انگوٹھیوں سے مزین تھیں مجھے اپنے پیچھے ہوشیاری کے ساتھ چلے آنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اور اگرچہ اس اجاڑ محل کے بے شمار کمروں میں جس کی تمام آوازیں خوابیدہ مگر آوازوں کی بازگشت بیدار تھی۔ میرے علاوہ کوئی ایک متنفس بھی موجود نہ تھا۔ لیکن میں ہر قدم پر ڈر جاتا تھا۔ کہ کوئی جاگ نہ جائے۔ محل کے بیشتر کمرے بند رہتے تھے۔ اور میں ان کے اندر کبھی داخل نہ ہوا تھا۔

میں اپنی سانس روکے ہوئے خاموش قدموں کے ساتھ اپنی غیر مرئی رہنما کے پیچھے ہو لیا۔ اس طرح خدا جانے کتنے تنگ راستے کیسی کیسی طویل غلام گردشیں کتنے عظمت مآب درباری کمرے اور بند حجرہ خانے عبور کئے۔

اگرچہ میں اپنی حسین رہنما کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کی شکل میری دماغی آنکھ سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ کوئی عرب لڑکی تھی۔ اس کے

سڈول مرمریں بازو اس کی ڈھیلی آستینوں کے درمیان سے نظر آ رہے تھے۔ ایک باریک نقاب اس کے چہرہ پر آویزاں تھی۔ اور ایک خمیدہ خنجر اس کے پہلو میں لٹک رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ الف لیلہ کی ایک رات رومان کی دنیا سے بھٹک کر مجھ تک آ گئی ہے اور میں آدھی رات کے سناٹے میں مینہ میں ڈوبے ہوئے بغداد کی تنگ و تاریک گلیوں سے گذرتا ہوا کسی جگہ جا رہا ہوں جو خطرات سے لبریز ہے۔

آخر کار میری خوبصورت رہنما ایک گہرے نیلے پردے کے سامنے ٹھہر گئی اور ایسا معلوم ہوا گویا وہ مجھے اسی چیز کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہاں کوئی بھی چیز نہ تھی لیکن یکایک ایک زبردست خوف نے میرے دل میں خون کو منجمد کر دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ فرش پر پردے کے پاس ایک خوفناک شکل و صورت کا حبشی خواجہ سرا بیٹھا ہے۔ جو قیمتی کمخواب میں ملبوس ہے۔ اور اپنے پاؤں پھیلائے ہوئے ایک ننگی تلوار اپنے پہلو میں رکھے نیند کے عالم میں اونگھ رہا ہے۔ میری حسین رہنما نے اس کے پاؤں کے اوپر سے نہایت آہستگی سے دوسری طرف قدم رکھا اور پردے کا ایک گوشہ اوپر اٹھا دیا۔ میں نے اندر والے کمرے کی ایک جھلک دیکھی وہاں فرش پر ایک ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ اور ایک مسہری پر کوئی شخص بیٹھا تھا۔ غالباً کوئی عورت تھی میں اسے پوری طرح نہ دیکھ سکتا تھا۔ مجھے دو حسین و جمیل پاؤں کی ایک جھلک

نظر آئی جو زرکار جوتوں سے مزین تھے اور ایک ڈھیلے زعفرانی پاجامہ سے باہر لٹک کر زرنگاری قالین پہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک سمت آسمانی رنگ کی بلوری قاب تھی جس میں کچھ سیب انار ناشپاتیاں، سنگترے اور انگوروں کے خوشوں کا ڈھیر تھا۔ دو چھوٹے پیالے اور ایک زرین مینا بالکل اس طرح رکھی ہوئی تھی۔ جیسے کسی مہمان کا انتظار ہو۔ اندر عود و لوبان کی قسم کی کوئی ایسی چیز سلگ رہی تھی۔ اس کے خوشبودار اور نشہ آور بخارات میرے ہوش و حواس کو شل کئے دیتے تھے۔

جیسے ہی میں نے کانپتے ہوئے دل کے ساتھ خواجہ سرا کے پھیلے ہوئے پاؤں کے اوپر سے گذرنے کی کوشش کی وہ یکایک چونک کر بیدار ہو گیا اور تلوار اس کے پہلو سے پھسل کر سنگ مرمر کے فرش پر ایک جھنکار کے ساتھ آ پڑی۔

ایک زبردست چیخ سن کر میں اچھل پڑا اور میں نے دیکھا کہ میں پسینے میں بری طرح بھیگا ہوا اپنی سفری چارپائی پر بیٹھا تھا کم سن چاند صبح کی روشنی میں بالکل ایسا زرد نظر آ رہا تھا۔ جیسے [illegible] رات بھر کا جاگا ہوا مریض اور باہر دیوانہ مہر علی روزانہ کے معمول کے مطابق سنسان سڑک پر چلاتا جا رہا تھا۔ دور رہو! دور رہو! دور رہو!

اس طرح میری الف لیلہ کی ایک رات اچانک ختم ہو گئی مگر ابھی ایک ہزار راتیں اور باقی تھیں۔

(۴)

اس واقعہ کے بعد میرے شب و روز میں ایک عجیب افتراق و اختلاف پیدا ہوگیا۔ دن کے وقت میں خستہ و نڈھال ہوکر جب اپنے کام پر جاتا تو سحر کا رات اور اس کے بے حقیقت خوابوں پر لعنت بھیجنے لگتا۔ لیکن جیسے ہی رات آتی مجھے اپنے دن کی زندگی اور اس کے مشاغل کی قید و بند۔ ایک حقیر و باطل اور مضحکہ انگیز خود فریبی معلوم ہونے لگتی۔

رات ہونے کے بعد میں ایک عجیب سکر و نشہ کے جال میں پھنس کر بے بس ہو جاتا تھا۔ اس وقت میں گذشتہ زمانہ کے کسی نامعلوم انسان میں تبدیل ہو جاتا۔ اور بے لکھی تاریخ میں اپنے حصّے کے کارنامے پورے کرنے لگتا تھا۔ میرا چھوٹا انگریزی کوٹ اور چست برجس میرے لئے ذرا بھی موزوں ثابت نہ ہوتی تھی۔ سرخ مخملی ٹوپی، ڈھیلا پائجامہ زرکار بیٹی طویل ریشمی عبا عطر میں بسے ہوئے رنگین رومال ان سب چیزوں سے میں اپنا لباس باقاعدہ پورا کرتا ایک اونچی گدّے دار کرسی پر بیٹھتا اور اپنی سگرٹ کے بجائے گلاب کے عرق سے بھرے ہوئے ایک پیچوان سے شغل کرنے لگتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی اپنے محبوب کی عجیب ملاقات کے پرشوق انتظار میں بیٹھا ہو۔

مجھے حیرت انگیز واقعات کے اظہار کی قدرت نہیں جو رات کی

تاریکی کے بڑھتے ہی ظہور پذیر ہونے لگتے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا گویا اس وسیع عمارت کے عجیب و غریب کمروں میں ایک خوبصورت افسانے کے ٹکڑے نسیم بہار کے تند جھونکوں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ ایک ایسے افسانے کے ٹکڑے جس کا تھوڑا سا حصہ میری نظروں کے سامنے مگر اختتام بالکل مخفی تھا رات بھر میں ان ٹکڑوں کے تعاقب میں پھرا کرتا تھا۔

پھر خواب کے ٹکڑوں کی اس آندھی کے درمیان حنا کی خوشبو اور رباب کی جھنکار کے درمیان عود و لوبان کی مہک سے بھری ہوئی ہوا کی لہروں کے درمیان مجھے بجلی کی چمک کی طرح ایک حسین دوشیزہ کی ایک لمحی جھلک نظر آتی۔ یہی تھی جو زعفرانی رنگ کے پائجامہ میں ملبوس تھی جس کے حنا آلود نرم پاؤں زرکار جوتوں سے مزین تھے۔ اس کے جسم پر ایک زریں نقوش کا تنگ و چست پیرہن ہوتا تھا۔ سر پہ ایک سرخ ٹوپی جس کی سنہری جھالر اس کی برف جیسی سفید پیشانی اور صبیح رخساروں پر لٹکی رہتی تھی۔

اس نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔ میں اس کے تعاقب میں تہ خانے کے عالم زیریں کے اندر ایک سحر زدہ خواب زار کی پیچ در پیچ گلیوں کے درمیان ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں اور ایک روش سے دوسری روش پر دیوانہ وار گھومتا پھرتا تھا۔

بعض اوقات شام کے وقت جبکہ دو روشن شمعوں کے درمیان

ایک بڑے آئینے کے سامنے میں خود کو بڑی احتیاط کے ساتھ ایک
شاہی نسل کے شہزادہ کے لباس سے آراستہ کرتا تو مجھے یکایک آئینے میں
اپنے عکس کے پہلو میں اس ایرانی حسینہ کا عکس نظر آتا۔ اس کی
گردن کا تیز خم اُس کی موٹی سیاہ آنکھوں میں شدید جذبات اور تکلیف
کی ایک تیز اور پُر شوق جھلک اس کے سُرخ و نازک لبوں پر گویائی
کا ایک خفیف سا وہم۔ اس کا حسین و متناسب جسم پھلے پھولے
درخت کی طرح جوانی سے لدا ہوا۔ اس کے خوبصورت خرام میں
اس کے اعضا کی دلربا حرکت، مسرت و اشتیاق اور تکلیف کی
ایک خیرہ کن چمک ایک تبسم ایک نظر اور جواہرات و ریشمی ملبوس
کی ایک تیز چمک اور پھر اس کے بعد وہ فضا میں تحلیل ہو کر غائب
ہو جاتی۔ تیز ہوا کا ایک وحشی جھونکا۔ پہاڑیوں اور جنگلوں کی خوشبو
سے لبریز میری شمعوں کو بجھا دیتا اور میں اپنا لباس دُور پھینک کر
چارپائی پر دراز ہو جاتا۔ آنکھیں بند اور جسم مسرت سے لرزتا ہوا
اور پھر میرے چاروں طرف نسیم کی موجوں میں جنگلوں اور پہاڑیوں
کی خوشبو کے درمیان خاموش تاریکی میں بہت سی ہم آغوشیاں
بہت سے پیار اور ہاتھوں کے بہت سے نرم و نازک لمس تیرنے لگتے
میرے کانوں میں لطیف سرگوشیاں ہوتیں۔ اور مجھے اپنی پیشانی
پر بہت سے معطر سانس محسوس ہوتے یا پھر ایک بھینی بھینی خوشبو
والا رومال بار بار میرے رخساروں سے مس ہونے لگتا۔ اس کے

بعد آہستہ آہستہ ایک پراسرار ناگن میرے جسم کے چاروں طرف اپنا مہوش کن جسم لپیٹنے لگتی۔ میں ایک گہری آہ کے ساتھ بیہوشی میں ڈوب جاتا اور اس کے بعد ایک گہری نیند کھو جاتا۔

ایک دن شام کے وقت میں نے گھوڑے پر سوار ہو کر باہر جانے کا ارادہ کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھ سے باہر نہ جانے کی کون التجی کر رہا تھا۔ مگر اُس دن میں کسی کی بھی التجاؤں کو سُننے کے لیئے تیار نہ تھا۔ میرا انگریزی کوٹ اور ہیٹ ایک سفری الماری پر پڑے تھے۔ اور میں ان کو اٹھانے والا ہی تھا۔ کہ یکایک سنسنتہ ندی کے ریت اور اردہ لی پہاڑیوں کے سوکھے پتوں کو لیئے ہوئے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور میرے کوٹ اور ہیٹ کو اپنی موجوں میں لپیٹ کر ایک دائرے کی شکل میں چکر دینے لگا۔ اُسی وقت بشاش قہقہے کی ایک بلند آواز پیدا ہوئی اور زیادہ سے زیادہ بلند ہوتی چلی گئی۔ یہانتک کہ قہقہے کے تمام لہجوں کو ختم کر کے غروب آفتاب کی دُنیا میں گم ہو گئی۔

میں گھوڑے پر باہر نہ جا سکا۔ اور اگلے دن میں نے اپنے انگریزی کوٹ اور ہیٹ سے ہمیشہ کیلئے جدائی اختیار کر لی۔

اس روز پھر آدھی رات کے سناٹے میں مجھے کسی کے رونے کی لرزتی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔ بالکل اسی طرح جیسے چارپائی کے نیچے سے فرش کے نیچے سے اس عظیم محل کی سنگین بنیادوں کے نیچے سے کسی تاریک و نم انجیر قبر کی گہرائیوں میں سے ایک آواز

رحم طلب انداز میں مجھ سے التجا کر رہی ہو کہ آہ! مجھے بچاؤ! ان بے تعبیر خوابوں کو۔ ان موت جیسی نیندوں کو اور اس سخت سراب کو توڑتے ہوئے اندر چلے آؤ مجھے اپنے گھوڑے کے زین پر اپنے پہلو میں بٹھاؤ۔ کلیجے سے لگاؤ اور پہاڑیوں جنگلوں اور دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے مجھے اپنی بالائی دنیا کی گرم درخشانی میں لے جاؤ۔

اس کے جواب میں میں سوچتا ہوں کون ہوں؟ آہ میں تجھے کس طرح نجات دلا سکتا ہوں؟ مجھے کس غرق ہونے والی حسینہ اور کس محبت مجسم کو خوابوں کے اس گرداب سے نکال کر ساحل تک پہنچایا ہے۔ اے حسین و فردوسی ہستی تیری زندگی کا خوبصورت پھول کس جگہ اور کب شگفتہ ہوا تھا؟ کون سے سرچشمے کے کنارے کھجوروں کے کنج کے گوشے سایہ میں اور صحراؤں کی کس آوارہ و خانماں برباد ہستی کی آغوش میں تو پیدا ہوئی تھی؟ وہ بدو کون تھا جو تجھے تیری ماں کے بازوؤں سے اس طرح چھین کر لے گیا۔ جیسے کھلتی ہوئی کلی کو صحرائی درخت سے توڑ لیا جائے۔ ہاں وہ کون تھا جس نے تجھے یوں پکڑ کر ایک برق صفت رہوار پر بٹھایا اور پھر تپتے ہوئے ریگستانوں کو عبور کر کے وہ تجھے شاہی شہر کے غلاموں کے بازار میں لے گیا؟ اور وہاں بادشاہ کا وہ کارکن کون تھا جس نے تیری شرمگیں شگفتہ جوانی کو دیکھ کر تیری قیمت سیم و زر میں ادا کی۔ تجھے ایک زریں پالکی میں بٹھایا اور ایک تحفہ کی صورت میں تجھے اپنے بادشاہ کے حرم

سر کیلئے پیش کر دیا! آہ! اس مقام کی تاریخ سارنگ کی موسیقی، چوڑیوں کی جھنکار، گاہے گاہے خنجروں کی چمک، شیرازی نے کی آب و تاب اور ان سب کے درمیان دل میں چبھ جانے والی تیز نگاہ۔ کتنا لامحدود تجمل! کتنی لامتناہی غلامی تیرے داہنے اور بائیں خوبصورت کنیزیں مور چھل ہلاتی تھیں جن کے دست بند پر بڑے بڑے ہیرے چمکتے تھے۔ بادشاہ شاہوں کا شاہ تیرے برہنہ جیسے سفید پاؤں کے جواہر کار جوتوں کے پاس اپنے گھٹنوں کے بل جھک جاتا تھا۔ اور کمرے کے باہر دہشتناک حبشی خواجہ سرا مغرق لباس پہنے قاصد مرگ کی صورت لئے ہوئے برہنہ شمشیر سنبھالے کھڑا رہتا۔ مگر اے ریگستان کے پھول یہ تو بتا کہ جب شان و تجمل کا خیرہ کن اور خونیں سمندر تجھ کو اپنے رشک۔۔۔ و حسد کے جھاگ اور سازش و فریب کے پتھروں کے ساتھ بہا لے گیا۔ تو پھر ظالم موت کے ساحل پر تجھے پھینک دیا گیا۔ یا کون سے دوسرے ملک میں کسی اور زیادہ شاندار اور ظالم ملک میں تجھے چھوڑ دیا گیا؟ یکایک اسی لمحہ وہی دیوانہ مہر علی چلا اٹھا۔

"دور ہو! دور ہو! سب جھوٹ ہے! سب جھوٹ ہے!"

میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ دن کی روشنی کافی پھیل چکی تھی۔ میرا چپڑاسی اندر داخل ہوا اور میرے خطوط مجھے دے کر باورچی آیا اور سلام کے بعد میرے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے کہا، نہیں میں اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا!!
اسی روز میں نے اپنا سارا سامان باندھا اور اپنے دفتر میں منتقل ہوگیا۔ بوڑھے کریم خاں نے مجھے دیکھا تو خفیف سا مسکرا دیا۔ اس کا تبسم میرے دل کو چبھتا معلوم ہوا۔ لیکن میں نے کچھ نہ کہا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

(۵)

مگر شام کے قریب آتے ہی میرا دماغ کھویا کھویا سا معلوم ہونے لگا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کہ مجھے کسی سے ملاقات کا وعدہ پورا کرنا ہے۔ اور اس کیفیت میں حسابات کی ہر چیز اور روئی کمانے کا ہر کام ہر مشغلہ بالکل ہیچ۔ لغو اور قابل نفرت محسوس ہوتا تھا۔
میں نے قلم ہاتھ سے پھینک دیا۔ حسابات کا رجسٹر بند کر دیا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ میری گاڑی ٹھیک غروب آفتاب کے وقت سنگ مرمر کے محل کے پھاٹک پر خود بخود رک گئی۔ تیز قدموں کے ساتھ میں سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اور کمرے میں داخل ہوا۔
اندر ایک گہری خاموشی مستولی تھی۔ تاریک کمرے ایسے غمگین نظر آتے تھے۔ گویا مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں۔ میرا دل پشیمانی سے لبریز تھا۔ مگر وہاں کون تھا۔ جس سے میں اس پشیمانی کا اظہار کرسکتا یا معافی طلب کرتا؟ میں ایک خالی دماغ کو لئے ہوئے

اندھیرے کمرے میں گھومنے لگا تمنا تھی کہ میرے پاس کوئی رباب ہوتا جس سے ہم آہنگ ہوکر میں محل کی نامعلوم ہستی کو یہ نغمہ سناتا۔ کہ اے شمع۔ وہ مغرور پروانہ جس نے تیرے پاس سے اُڑ جانیکی ناکام کوشش کی تھی۔ اب پھر تیرے پاس لوٹ آیا ہے۔ بس ایک مرتبہ اسے معاف کردے۔ اس کے بال و پر کو جلا ڈال اور اپنے شعلے میں اس کو بھسم کردے۔"

اچانک آنسوؤں کے دو قطرے میرے سر کے اُوپر سے میری پیشانی پر گر پڑے۔ اس روز پہاڑیوں کی چوٹی پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ تاریک جنگل اور شکستہ ندی کی موجیں ایک دہشتناک تعطل اور منحوس سکوت کے عالم میں انتظار کر رہی تھیں۔ یکایک زمین پانی اور آسمان کانپ اُٹھے۔ اور طوفان کا ایک وحشی جھونکا دُور اُفتادہ بے راہ جنگلوں میں سے چیختا ہوا اور بجلی کے چمکدار دانت اس طرح دکھاتا ہوا گذرا جیسے کوئی ہرزہ دیوانہ اپنی زنجیریں توڑکر بھاگ رہا ہو۔ محل کے اجاڑ کمروں نے ایک بلند آواز کے ساتھ اپنے دروازے بند کر دیئے۔ اور دہشت کی تلخی سے کراہنے لگے۔

ہمارے ملازم دفتر میں تھے۔ اور یہاں لیمپ روشن کرنیوالا کوئی نہ تھا۔ رات ابرپوش تھی۔ اور چاند سے محروم۔ اندر گہری تاریکی میں مجھے صاف صاف محسوس ہوا کہ چارپائی کے نیچے فرش کے قالین پر کوئی عورت اُلٹے منہ پڑی ہوئی اپنی مایوس انگلیوں سے اپنے لمبے لمبے

پریشان بالوں کو پکڑ کر دیوانوں کی طرح نوچ رہی ہے۔ اسکی خوبصورت پیشانی سے خون بہہ رہا تھا وہ کبھی ایک سخت و کرخت اور غمگین قہقہہ بلند کرتی تھی۔ تو کبھی زور دار سسکیوں کے رو پڑتی یا پھر اپنا پیرہن چاک کر کے اپنے حسین سینے کو پیٹنے لگتی تھی۔ کھلے ہوئے دریچے میں ہوا گرجتی ہوئی آ رہی تھی۔ اور بارش موسلا دھار ہونے لگی تھی۔ جو اس عورت کو پوری طرح شرابور کیئے ڈالتی تھی۔

رات بھر بارش ذرا نہ رکی اور نہ اس عورت کی جذبات بھری اشک ریزی ختم ہوئی۔ میں اپنے سینے میں ایک ایسا غم لئے ہوئے تھا۔ جو کسی کے کام کا نہ تھا۔ اور اسی کیفیت میں ساری رات ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومتا رہا۔ جب کوئی بھی میرے پاس نہ تھا تو میں آخر کسے تسکین دے سکتا تھا۔ یہ کون عورت تھی جو رنج و غم کی شدید جانکنی میں مبتلا تھی؟ یہ ناقابل تسکین غم اسے کہاں سے ملا تھا؟ عین اس وقت یکایک وہی پاگل آدمی چلا اٹھا۔ دور رہو! دور رہو! مجھ پر شک ہے! سب جھوٹ ہے۔"

میں نے دیکھا پو پھٹ چکی تھی۔ اور مہر علی موسم کی اس ہشتناک حالت میں بھی محل کے چاروں طرف حسب معمول چیختا جا رہا تھا یکایک مجھے خیال آیا۔ کہ شاید وہ بھی کبھی ایک مرتبہ اس مکان میں رہ چکا ہو۔ اور اگرچہ وہ دیوانہ ہو گیا ہے لیکن وہ روزانہ یہاں آتا ہے۔ اور اس مرمریں شیطان کے خوفناک جادو سے مسحور ہو کر طواف کیا

کرتا ہے۔

طوفان اور بارش کے باوجود میں دوڑ کر اسکے پاس پہنچا اور پوچھا "مہر علی کیا شئے ہے۔ جسے تم جھوٹ کہتے ہو؟"

اس نے مجھے کوئی جواب دیا۔ بلکہ مجھے ایک طرف ہٹا کر پھر اپنی دیوانگی آمیز صدا لگاتا ہوا مکان کے چاروں طرف یوں گھومنے لگا۔ جیسے کوئی مسحور پرندہ سانپ کے جبڑوں کے چاروں طرف اُڑ رہا ہو۔ وہ گھوم رہا تھا اور خود متنبہ کرنے کی ان تھک کوشش کے لیے چلا جاتا تھا۔

"دور رہو! دور رہو! سب جھوٹ ہے!"

موسلا دھار بارش میں ایک دیوانے کی طرح دوڑتا ہوا میں اپنے دفتر میں پہنچا اور کریم خاں سے پوچھا۔ مجھے بتاؤ ان سب باتوں کا کیا مطلب ہے۔

اس بوڑھے شخص سے مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ تھا۔ کہ کسی زمانے میں اس محل کے اندر بے شمار محروم تسکین جذبات ناکامیاب تمنائیں اور آگ کی طرح بھڑکنے والے عیش و نشاط کے خوفناک شعلے آوارہ تھے۔ اور ان تمام آلام قلب اور پامال امیدوں نے اس محل کے ہر ایک پتھر کو اس قدر پیاسا اور بھوکا بنا دیا تھا۔ کہ جو کوئی زندہ انسان اتفاق سے اس کے نزدیک پہنچ جاتا۔ تو محل کے در و دیوار ایک فاقہ زدہ آدم خور دیو کی طرح اسے نگل جانے کے لئے بیتاب ہو جاتے تھے۔ جو لوگ بھی وہاں مسلسل تین رات تک رہے

ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں کہ ان کے بے رحم جبڑوں سے بچ گیا ہو۔ سوائے مہر علی کے جو اپنے ہوش و حواس کو کھو کر زندہ و محفوظ رہ گیا تھا۔

میں نے پوچھا "کیا میری نجات کا کوئی بھی طریقہ نہیں ہے؟"

بوڑھے آدمی نے جواب دیا۔ صرف ایک طریقہ ہے اور وہ بہت دشوار ہے۔ میں تمہیں وہ طریقہ بتا دوں گا۔ مگر اس سے پہلے تمہیں اس نوجوان ایرانی دوشیزہ کی کہانی سُن لینی چاہیئے۔ جو کبھی عیش و نشاط کے اس مقبرے میں رہتی تھی۔ اس کہانی سے زیادہ عجیب یا حزنیہ ڈرامہ اس زمین پر کبھی نہیں کھیلا گیا۔۔۔۔"

(۶)

ٹھیک اسی وقت قلیوں نے بتایا کہ گاڑی آرہی ہے۔

اس قدر جلدی! ۔۔۔ ہم نے عجلت کے ساتھ اپنا سامان باندھا ہی تھا۔ کہ ٹرین آگئی۔ ایک انگریز جو کہ غالباً ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ ایک فرسٹ کلاس درجے کی کھڑکی سے مرزکا لے سٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر ہمارے ہمسفر پر پڑی اس نے چلا کر "ہلو" اور اسے اپنے درجے میں بلا لیا۔

چونکہ ہم سیکنڈ کلاس میں بیٹھے تھے۔ اس لئے ہمیں یہ معلوم کرنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ کہ وہ آدمی کون تھا۔ اور اس کی کہانی

کا کیا انجام ہوا۔

میں نے کہا: "اس شخص نے ضرور ہم کو بے وقوف سمجھا۔ اور مذاق میں ہم کو خوب فریب دیا۔ اسکی کہانی شروع سے آخر تک بالکل من گھڑت ہے۔"

اور اس کے بعد جو گفتگو شروع ہوئی وہ تا میرے تخفیہ سافسٹ رشتہ دار اور میرے درمیان ایک عمر بھر کے قطع تعلقات پر ختم ہوئی۔

دروازہ

(۱)

"ماشی"

"جوتن سو رہو رات جا رہی ہے۔"

"خیر جانے دو۔ میں بھی اب کچھ دن کا مہمان ہوں۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ موتی اپنے باپ کے پاس ہو آئے۔۔ مگر اب وہ کہاں ہونگے؟"

"سیتا رام پور۔"

"ہاں سیتا رام پور پھر اس کو بھیجدو۔ اس کو بیمار کے پاس زیادہ نہیں رہنا چاہیئے۔ وہ خود بھی تو ضعیف ہے۔"

"اے لڑکے کی باتیں تو سنو! ایسے میں وہ تمہیں چھوڑ کر کیونکر چلی جائے؟ کیا اُسے نہیں معلوم کہ ڈاکٹروں نے کیا رائے دی ہے۔"

"یہ تو اس کو بھی نظر آتا ہے اُس روز باپ کے گھر جانے کی اس کے کان میں بھنک پڑ گئی تھی۔ کہ بس اس نے روتے روتے اپنی آنکھیں لال کر لیں۔

اس موقعہ پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس گفتگو کے اعادہ میں ماشی نے اگر غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ تو اصل واقعہ کے معنی بالکل ہی غلط پہنائے ہیں ذیل میں سوتی کی اصل گفتگو درج کی جاتی ہے۔

"بہو کیا تمہارے باپ نے کچھ کہلا بھیجا ہے اننت کو میں نے کل یہاں دیکھا تھا؟"

"ہاں اگلے شکروار کو میری ننھی بہن کا انپراشن ہے۔ اور میرا قصد ہے کہ"

"بہت اچھا بیٹی اُس کے لئے ایک سونے کی مالا بھیج دو تمہاری ماں خوش ہو جائینگی۔"

"میں خود ہی جانے کا ارادہ کر رہی ہوں۔ جی بہت چاہتا ہے اور میں نے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا بھی نہیں"

"جو کچھ بھی تم کرو۔ مگر ایسی حالت میں تو جو تن کو چھوڑ کر تم نہ جاؤ گی تم نے تو سنا تھا۔ کہ ڈاکٹروں نے کیا کہہ دیا ہے؟"

"ہاں مگر ڈاکٹر نے کہا تھا۔ کہ فی الحال کوئی خاص وجہ فکر و تشویش کی نہیں ہے۔

"اگر ایسا کہا بھی تو کیا ہوا، تم خود تو اُس کی حالت دیکھو!"
"میں سُن رہی ہوں کہ تقریب بہت بڑی ہوگی ویسے بھی تین بھائیوں کے بعد ایک ہی لڑکی ہے۔ اگر میں نہ گئی تو ضرور ماں کو رنج و ملال ہوگا۔"
"ہاں ٹھیک ہے میں تمہاری ماں سے تو پورے طور پر واقف نہیں لیکن یہ جانتی ہوں کہ اگر تمہارے والد کو معلوم ہوا کہ تم جو تن کو کس حالت میں چھوڑ کر آئی ہو تو وہ ضرور ناراض ہونگے۔"
"آپ ایک دو سطریں اس مضمون کی لکھ بھیجئے گا کہ کوئی خاص تردد کی بات نہیں ہے۔ اور اگر میں جاؤں بھی تو گھر کے کاموں میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"
"تم ٹھیک کہتی ہو۔ اگر تم چلی جاؤ تو کوئی خاص نقصان نہ ہوگا۔ لیکن اگر میں تمہارے والد کو لکھوں گی تو جو کچھ میرا خیال ہے۔ میں صاف صاف لکھ دونگی۔"
"اس صورت میں آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میں ان سے کہوں گی اور مجھ کو یقین ہے کہ وہ ....."
"لڑکی میں بہت برداشت کر چکی! لیکن اگر تم نے ایسا کیا تو میں چپ نہ رہونگی۔ تمہارے والد تم سے خوب واقف ہیں اس لئے تم ان کو دھوکا نہیں دے سکتیں!"
ماشی اُدھر گئی اور موتی اپنے پلنگ پر غصہ میں لیٹ رہی اس

کی ہمسایہ ہنسیلی اور پوچھنے لگی کہ کیا بات ہے؟

موتی بولی: "دیکھو تو! کیسی شرم کی بات ہے! میرے ایک ہی بہن اور اس کی اپریشن میں مجھے جانے نہیں دیتے۔"

"مگر بی بی کیا تم ان کو ایسی بیماری میں چھوڑ کر جانا چاہتی ہو!"

"میں اُن کو کیا آرام پہنچا رہی ہوں؟ اور پہنچانا چاہوں بھی تو کیا کروں؟ یہ گھر ہی کچھ ایسا بھیا نک ہے۔ بس میرا تو جی اکھڑ گیا۔"

"تم عجیب طرح کی عورت ہو۔"

"ہاں مگر مجھے تم لوگوں کی طرح دھوکا اور فریب کرنا نہیں آتا۔ کہ لوگوں کے ڈر سے سوگ منانے منہ بنا کر بیٹھ جاؤں۔"

"کیسی خود مختار عورت ہے!"

(۳)

جوتن نے جب سُنا کہ موتی اپنے باپ کے گھر جانے کا ذکر سننے ہی رونے لگی تو اس کو اس درجہ مسرت ہوئی کہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا تکیوں کو اپنی طرف سرکا کر پھر اُن سے سہارا لگا لیا۔ اور کہنے لگا۔ ماشی اس کھڑکی کو ذرا سا کھول دو اور روشنی ہٹا لو۔"

خاموش رات مسافر عدم کیطرح کھڑکی پر سکوت میں کھڑی تھی تارے جو غیر محدود زمانہ سے سینکڑوں موت کے منظر دیکھ چکے ہیں اب بھی ٹکٹکی باندھے رہے تھے۔ جوتن موتی کی صورت اس شب

تاریک پر نقش پاتا تھا اور اُس کی دو نو مخموں آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں! ماشی اُس کو اس طرح خاموش پا کر مطمئن ہو گئی اور سمجھی کہ شاید وہ سو گیا یکبارگی وہ چونکا اور کہنے لگا "ماشی تم کہتی تھی کہ موتی ایسی نہیں ہے کہ ہمارے گھر میں خوش رہ سکے اب تم نے دیکھا؟"

"ہاں بیٹا اب میں دیکھتی ہوں بے شک میرا خیال غلط نکلا تجربہ ہی سے آدمی کا حال کھلتا ہے۔"

"ماشی"

"پیارے جو تم اب سو رہو۔"

"تھوڑی دیر رہنے دو، ماشی خفا ہو میں ذرا اور باتیں کر لوں۔"

"اچھا بہت اچھا۔"

"ایک مرتبہ جب میں سمجھتا تھا کہ موتی مجھ سے محبت نہیں کرتی تو میں تو اس کو خاموشی سے برداشت کرتا تھا۔ مگر تم ... کیا تم کو یاد ہے؟"

"نہیں بیٹا میں تمہیں یہ نہ کہنے دونگی، میں نے بھی برابر برداشت کیا۔"

"ہاں مگر تم جانو ہمارے دماغ مٹی کے ڈلے تو ہیں نہیں کہ ہاتھ میں اُٹھاتے ہی تم اپنے قبضہ میں کر لو اور میں خود محسوس کرتا تھا کہ موتی ابھی تو نہیں سمجھتی مگر جب کوئی صدمہ پیش آئے گا۔

"ہاں جوتن تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"ماشی نے اپنی آہ سرد کو روکا اور خاموش رہی ایک مرتبہ نہیں بار ہا اُس نے جوتن کو برآمدہ میں مینہ کی بوچھار میں پڑے ہوئے دیکھا۔ مگر وہ اپنے سونے کے کمرے میں گیا۔ بار ہا وہ پڑا ہوا کروٹیں بدلتا رہتا اور وہ جانتی تھی کہ مرلی کا انتظار کر رہا ہے۔ کہ وہ آئے اور اُس کو منائے مگر وہ تھیٹر جانے کی تیاری میں مشغول ہوتی پھر بھی اگر ماشی اُس کے پاس جا کر اُسے پنکھا جھلنے لگتی تو وہ بگڑ کر اُسے واپس بھیج دیتا۔ بار بار ماشی اس سے کہنا چاہتی کہ "جوتن تم کیوں اس قدر اس بیوقوف لڑکی کا خیال کرتے ہو۔ اسکے جذبۂ طلب کو بڑھاؤ اور اس کو سبق سکھنے دو۔ مگر یہ باتیں کہنے کی نہ تھیں۔ اور اُن سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ جوتن کا دل حسن کی دیوی کا مندر تھا۔ اور اس کے تخت پر ہوئی متمکن تھی وہ اس بات کا خیال نہ کر سکتا تھا کہ خود اُس کی قسمت اُسے اس جام محبت سے محروم کر دے گی جس کا دور کسی دیوی کی درگاہ سے چلتا تھا۔ اسی لیئے پرستش جاری تھی قربانیاں برابر چڑھائی گئیں اور اُمید منقطع نہ ہوئی۔

ماشی سمجھ رہی تھی کہ جوتن سو رہا ہے کہ وہ یکبارگی بولا۔ میں جانتا ہوں تمہارا یہ خیال تھا کہ میں موئی سے خوش نہیں اور اس لیئے تم سے ناراض تھیں۔ لیکن ماشی مسرت ان ستاروں کی مانند ہے جیسے دیکھو وہ ساری تاریکی پر غالب نہیں ہیں بیچ بیچ میں بہت سا تاریک

حصہ باقی ہے ہم زندگی میں غلطیاں کرتے ہیں۔ اور ان کو پوری طرح نہیں سمجھتے، تاہم بعض حصے باقی رہ جاتے ہیں، اور ان میں صداقت چمکتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا میرے دل میں مسرت کہاں سے جاگزیں ہو گئی ہے"

ماشی ہلکے ہلکے اس کا سر سہلا رہی تھی اور اپنے آنسوؤں کو تاریکی کے پردہ میں چھپائے ہوئے تھی۔

"ماشی وہ بہت کم عمر ہے" جوتن نے یکایک کہا "میں نہیں سمجھتا کہ اس کی زندگی کس طرح گذرے گی جب کہ میں۔۔۔"

"کم عمر! جوتن وہ تو خاصی بڑی چڑی ہے میں بھی جوان سی تھی۔ کہ میرا سر تاج میرے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ مگر اس روز سے وہ آج تک میرے دل میں ہے ایسی صورت میں مجھ کو کیا نقصان ہوا؟ اور علاوہ اس کے کیا زندگی کے لئے خوشی ایک جزو لازم ہے؟

"ماشی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مونی جب سے التفات پر مائل ہوئی ہے تو مجھ کو دیتا سے۔۔۔"

"جوتن اس کا خیال مت کرو یہ کوئی بری بات نہیں کہ وہ اب مائل التفات ہے"

دفعتاً جوتن کو ایک گیت یاد آگیا۔ جو اس نے بہت دن ہوئے ایک گاؤں میں سنا تھا۔

"اے میرے دل تو اس وقت نہ جاگا جبکہ تیرا مالک میرے دروازہ پر آیا تھا۔ اُس کے قدم واپسیں کی آواز پر تو جاگا، آہ! تو جاگا تو، مگر تاریکی میں!"

"ماشی اب کیا بجا ہوگا؟" اس نے یکایک پوچھا۔

"نو کے قریب وقت ہے۔"

ابھی تو بہت سویرا ہے! میں سمجھ رہا تھا کوئی دو یا تین بجے ہونگے تم جانو میری آدھی رات تو غروب آفتاب سے شروع ہو جاتی ہے۔ مگر تم کیوں میرے سونے کے لئے اس قدر مصر تھیں؟"

"یوں ہی کل تم کتنی رات تک جاگے اور باتیں کرتے رہے آج سویرے سے سو جاؤ۔"

"کیا موتی سو گئی؟"

"نہیں وہ تمہارے لئے شوربہ پکانے میں لگی ہوئی ہے۔"

"ماشی تم ہنسی تو نہیں کر رہی ہو کیا واقعی وہ . . . . ؟"

"ہاں ہاں! کیوں! وہ بیچاری تو تمہارا سارا کھانا تیار کرتی ہے۔"

"میں سمجھتا تھا۔ کہ شاید موتی کو پکانا نہیں آتا۔"

"عورتوں کو یہ کام سیکھتے کچھ دیر نہیں لگتی جب وقت پڑتا ہے آپ سے آپ سب آجاتا ہے۔"

صبح کو میں نے جو شوربا پیا وہ تو بڑے مزے کا تھا۔ میں سمجھتا تھا تم نے پکایا ہے۔"

"نہیں میں کہاں سے پکا تی رہوں مجھے تمہارا کام کب کرنے دیتی ہے! سارے کپڑے تمہارے وہ خود دھوتی ہے یہ تو اسے معلوم ہی ہے کہ کوئی میلی چیز تم اپنے پاس نہیں آنے دیتے. کاش تم خود دیکھتے کہ وہ تمہارا کمرہ کیسا صاف ستھرا رکھتی ہے. اگر میں اسے تمہارے پاس یہاں آنے دوں تو وہ بیٹھے بیٹھے اپنی جان ہلکان کرلے اور اُٹھنے کا نام نہ لے"

"مگر کیا موہنی کی صحت اس قابل ہے . . . ؟"

"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ مریض کے پاس اسے بار بار نہ جانے دیا جائے اس کا دل نہایت کمزور رہنے"

"مگر ماشی تم اسے یہاں آنے سے کس طرح روکتی ہو؟"

"وہ میری ہر بات مان لیتی ہے اور میں بھی اسے دم دم کی خبر دیتی رہتی ہوں"

ستارے آسمان پر آنسوؤں کے قطروں کی طرح چمک رہے تھے. جوتن نے اپنا سر اِس زندگی کے اظہار تشکر میں جھکا دیا. جو عنقریب رخصت ہونے والی تھی. اور جب موہنی نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اس کی طرف بڑھایا تو اس نے اُس کو کامل اطمینان وسکون کے ساتھ قبول کیا.

اس نے ایک آہ کھینچی اور کسی قدر اضطراب کے ساتھ کہنے لگا.

"ماشی اگر موہنی اب تک جاگ رہی ہو تو کیا وہ یہاں میرے

پاس صرف تھوڑی دیر کے لیے؟ ....''

''بہت اچھا میں ابھی جا کر بلاتی ہوں۔''

''میں اُسے دیر تک نہیں ٹھیراؤں گا صرف پانچ منٹ کے لیئے مجھے کچھ اُس سے ضروری بات کہنا ہے۔''

ماشتی نے ٹھنڈی سانس بھری اور موتی کو بلانے چلی گئی۔

اس عرصہ میں جوتن کی نبض کی حرکت بڑھ گئی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسکو کبھی بھی موتی سے راز و نیاز کی گفتگو کرنا نصیب نہیں ہوا اسلیئے کہ دونوں باجوں کا راگ جدا تھا اور دونوں سے ایک آواز کا نکلنا ناممکن جب کبھی اُس نے موتی کو اپنی ہمجلیس لڑکیوں میں ٹھٹھے مارتے اور بے تکلیف باتیں کرتے سُنا تو اس کا سینہ آتش رشک سے مشتعل ہو گیا مگر جوتن اپنے آپ ہی کو الزام دیتا تھا۔ کیوں نہیں وہ بھی اُسی طرح اِدھر اُدھر کی بے تکی باتیں ملاتا؟ یہ نہیں کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لیئے کہ اپنے احباب میں وہ بھی اکثر ایسی ہی ذرا ذرا سی باتوں پر بحثیں کرتا تھا مگر ذرا ذرا سی باتیں جو عورتوں کو پسند ہیں مردوں کو پسند نہیں کتنی مرتبہ جوتن نے جبکہ وہ موتی کے ساتھ کھلے برآمدے میں بیٹھا ہوتا سلسلہ گفتگو قائم کرنا چاہا۔ مگر ہر مرتبہ رشتۂ الفاظ شکستہ ہی نظر آتا جس سے خاموشی دونوں بھی شرمندہ رہتی۔ جوتن خوب سمجھ لیتا کہ موتی جانا چاہتی ہے اس لیئے وہ دل سے چاہتا۔ کہ کوئی تیسرا ہی آدمی آجائے اس وقت

شاید گفتگو کا موقعہ ملے اسلئے کہ دو سے تین آدمی زیادہ سہولت سے باتیں کر سکتے ہیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ موتی آئے تو میں کیا گفتگو کروں؟ مگر ان مصنوعی باتوں سے اس کا دل کب خوش ہونے لگا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ کہیں آج کی رات کے پانچ منٹ بھی ضائع نہ جائیں کیونکہ اس قسم کی گفتگو کیلئے اس کے پاس صرف چند لمحے باقی تھے۔

(۳۰)

"بیٹا یہ کیا کر رہی ہو، تم تو کہیں جانے والی نہ تھیں۔"

"میں سیتارام پور جارہی ہوں۔"

"آخر کیسے! ساتھ کون جارہا ہے؟"

"انتت"

"بیٹی آج نہ جاؤ پھر کسی دوسرے دن چلے جانا۔"

"مگر درجہ تو کرایا کر لیا گیا۔"

"خیر ہو جانے دو یہ کوئی بڑی بات نہیں کل سویرے چلے جانا۔"

"ماشی میں آپ کے منحوس دنوں کی قائل نہیں ہوں۔ آج چلی جاؤں تو کیا بگڑا جاتا ہے؟"

"جوتن تم سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

"اچھا ابھی تو بہت وقت ہے میں فوراً آجاتی ہوں اور ملے لیتی ہوں!"

"مگر یہ نہ کہنا - کہ تم جا رہی ہو"

"بہت اچھا میں نہ کہوں گی - مگر میں بہت دیر نہیں ٹھہر سکتی کل میری بہن کا اپریشن ہے اور آج میں جا کے رہوں گی"

"آہ میری بچی خدا کے لئے اس مرتبہ تو کہنا مان لو تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاؤ اور اس کے اطمینان سے جا بیٹھو - ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری عجلت کو سمجھ جائے"

"میں کیا کر سکتی ہوں اریل تو میرا انتظار کریگی نہیں اننت ابھی دس منٹ میں لوٹ آئے گا - میں اتنی دیر یہاں جا کر بیٹھی جاتی ہوں"

"نہیں تو بس رہنے دو - میں تمہیں اس گھبراہٹ میں ہرگز نہ جانے دونگی آہ بدنصیب لڑکی تو جس شخص پر ظلم کر رہی ہے - وہ جلد اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا - مگر میں سچ کہتی ہوں کہ تو بھی اس وقت کو اپنی آخری گھڑی تک نہ بھولے گی! بھگوان سے ڈر بھگوان کے غضب سے ڈر!"

"ماشی آپ مجھے اس طرح کوسیں تو نہیں"

"آہ میرے بیٹے پیارے بیٹے اب تو کس لئے زندہ ہے! اس ظلم کی کوئی انتہا نہیں - مگر کیا کروں میرے بس کی بات نہیں ہے!

ماشی اس خیال سے تھوڑا وقت ٹال کر بیمار کے کمرہ میں گئی کہ وہ اب سو گیا ہوگا - مگر جونہی وہ داخل ہوئی - کہ جیتن نے حرکت کی، ماشی بولی "دیکھا وہ کیا کہہ رہا ہے"!

"کیا ہوا؟ موتی نہیں آئی! ماشی تم نے کہاں اتنی دیر لگا دی؟"

"ارے میں جو پہنچی تو وہ زار زار رو رہی تھی اور صرف اسلئے کہ تمہارے حریرے کا دودھ چولھے پر جل گیا! میں نے بہت کچھ سمجھایا کہ دودھ اور آجائیگا مگر یہ خیال کہ تمہارے دودھ سے وہ اتنی غافل ہوجائے اُس کی آنکھ سے آنسو رکنے نہیں دیتا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اس کو تسلی دی اور سُلایا۔ بس اسی لئے میں اُس کو اپنے ساتھ نہ لاسکی۔

اچھا ہے اب سونے دو۔"

اگرچہ موتی کے نہ آنے پر جوہن کو سخت تکلیف ہوئی پھر اسکو ایک قسم کی تسکین تھی۔ اُس کو بہت کچھ یقین ہو گیا تھا کہ موتی کا جسم اس کی خیالی تصویر کے لئے بار ہوگا ایسے واقعات اس سے قبل بھی اس کو دُنیا میں پیش آچکے تھے اور یہ خیال کہ اس کے دودھ کے جل جانے پر موتی کو اس درجہ رنج ہوا اس کے لئے بے انتہا دلی مسرت کا باعث تھا۔

"ماشی"

"کیوں بیٹا کیا ہے؟"

"مجھے یقین ہے کہ اب میرا وقت آگیا مگر مجھے کچھ افسوس نہیں تم بھی میرے لئے رنج نہ کرنا۔"

"نہیں بیٹا میں کچھ رنج نہ کرونگی میرا یہ اعتقاد نہیں کہ صرف زندگی ہی باعث مسرت ہے اور موت نہیں۔"

"ناشی میں سچ کہتا ہوں ، موت بڑی خوشگوار ہے ۔"

جوتن آسمان کی تاریکی پر نظر جمائے ہوئے تھا ، اور یہ محسوس کر رہا تھا کہ گویا موتی خود موت کے بہانے سے آرہی ہے ۔ وہ حسن ہے غیر فانی مجسم اور ستارے امن و عافیت کے پھول ہیں جو مادر دہر کے ہاتھ سے اس کی لانبی اور سیاہ زلفوں پر برسائے جارہے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ پھر وہ رونمائی میں اپنی دلہن کا چہرہ دیکھ رہا ہے !

فضائے شب میں موتی کی محبت بھری آنکھوں کی کیفیت چھا گئی ۔ موتی اس کے گھر کی روشنی ۔ اس کے دل کی مالک ، موتی اس حسین دلہن عالم کے ہر حصہ میں نظر آنے لگی ۔ اس کا تخت ستاروں کی قربان گاہ اور موت و حیات کے اتصال پر نظر آتا تھا ۔ جوتن کا دل خوشی سے بھر گیا اور وہ فرط مسرت سے کہہ رہا تھا : آخر کار حجاب اٹھ گیا اور تاریکی میں روشنی نظر آرہی ہے ۔ اے حسن کی دیوی تو نے مدتوں میرے دل کو تکلیفیں دیں مگر اب تو مجھ سے جدا نہیں ہو سکتی !"

(۴)

"ناشی مجھے بہت سخت تکلیف ہے مگر اس قسم کی نہیں جیسی تم سمجھتی ہو ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری تکلیفیں اب رفتہ رفتہ میری زندگی سے رخصت ہو رہی ہیں ۔ میری زندگی اس باد وار کشتی کی طرح تھی جس کو مدتوں بہاؤ کے خلاف چلانے کی کوشش کی گئی مگر اس کی

رسی اب ٹوٹ گئی ہے اور وہ تیزی کے ساتھ آگے کو بہتی چلی جاتی ہے۔ میں اب اسکو دیکھ رہا ہوں مگر اب وہ میری نہیں ہے لیکن ماشی اس دو دن میں تو موہنی ایک مرتبہ بھی نظر نہیں آئی۔"

"جو تم لاؤ میں دوسرا تکیہ لگا دوں۔"

"ماشی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موہنی نے بھی اس کشتی غم کی طرح چھوڑ دیا ہے جو اب مجھ سے دور بھی چلی جاتی ہے۔"

"بیٹا ایک ذرا سا یہ عرق پی لو۔ تمہارا حلق خشک ہو گیا تھا۔"

"میں نے کل اپنا وصیت نامہ لکھا ہے کیا تمہیں نہیں دکھایا؟ مجھے یاد نہیں پڑتا۔"

"مجھے دکھانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔"

"جب اماں کا انتقال ہوا تو میرے پاس کچھ نہ تھا تم نے مجھے پرورش کیا کھلایا، پلایا۔ اس لئے میں سوچ رہا تھا۔۔"

"بیٹا کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ میرے پاس صرف یہ مکان تھا۔ تھوڑی سی جائداد اور باقی سب تم نے ہی پیدا کی۔"

"مگر یہ مکان۔۔۔"

کوئی بات نہیں تم نے بھی تو اس میں اتنا لگایا ہے کہ اب یہ تمیز کرنا دشوار ہے کہ میرا مکان تھا کدھر۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ موہنی تم سے محبت کرتی رہے گی۔۔۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے مگر اب تم سو رہو۔"

"اگرچہ میں اپنی ساری جائداد موتی کو دے رہا ہوں مگر عملاً وہ تمہارے ہی قبضہ میں رہے گی اور موتی اپنی ماشی کے کبھی خلاف نہ کریگی۔"

"بیٹا تم کیوں اس کے پیچھے اپنا سر کھپا رہے ہو؟"

"میرے پاس جو کچھ ہے سب تمہاری ہی بدولت ہے۔ اسلئے جب تم میرے وصیت نامہ کو دیکھو تو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہ کرنا . . . ."

"جوتن تم کیا کہہ رہے ہو کیا مجھے اتنا کم ظرف سمجھتے ہو۔ کہ مجھے اس کا خیال ہوگا۔ کہ تم اپنی جائداد موتی کو کیوں دے رہے ہو!"

"مگر نہیں تم کو بھی تو نہیں . . ."

"دیکھو جوتن میں تم سے خفا ہو جاؤں گی تم مجھے روپیہ دے کے تسکین دینا چاہتے ہو۔"

"کاش میں روپیہ سے زیادہ بہتر کوئی چیز دے سکتا!"

"جوتن وہ تو تم کافی سے زیادہ دے چکے ہو کیا تم میرے ویران گھر کی رونق نہ تھے؟ تم نے تو مجھے اس قدر دیا ہے کہ اگر میری قسمت مجھے کچھ نہ دے سکے تو بھی مجھے مطلق پرواہ نہیں تم موتی کو سب چیزیں دے دو۔ مکان، جائداد، گاڑی، گھوڑا۔ اس لئے کہ سب چیزیں اب میرے لئے بار ہیں اور ناقابل برداشت"!

"ہاں میں جانتا ہوں کہ تمہارے لئے اب زندگی میں کوئی لطف نہیں مگر موتی ابھی جوان ہے اور"

"نہیں یہ مت کہو اگر تم اس کو چاندا دے رہے ہو تو بالکل ٹھیک ہے مگر عورت کے لئے لطف و مسرت کی گھڑیاں اس کے مرد کے ساتھ ہوا کرتی ہیں۔"

"ماشی اگر وہ اپنی زندگی لطف و مسرت میں گزارے تو کیا ہرج ہے۔"

"نہیں یہ ناممکن ہے اس کے لئے عیش و آرام مصیبت و الم ہو جائے گا۔"

جوتن خاموش تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ صحیح ہے یا غلط اور آیا یہ قابل افسوس ہے یا نہیں کہ موتی کی زندگی صرف اس کے نہ ہونے سے تلخ ہو جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ستارے اس کے کان میں کہہ رہے ہیں "واقعی یہ ٹھیک ہے ہم ہزاروں برس سے دیکھ رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ عیش و عشرت کے یہ سارے سامان محض طلسم فریب ہیں۔"

جوتن نے ایک آہ کھینچی اور کہنے لگا "حقیقت میں ہم اپنے بعد وہ چیزیں نہیں چھوڑ سکتے جو چھوڑنے کے قابل ہیں۔"

"پیارے یہ بھی کچھ نہیں جو تم اسے دے رہے ہو بس یہی دعا کرو کہ خدا اسے اس زندگی کی قدر کرنے کی توفیق دے۔"

"ماشی ذرا وہ اننناس کا عرق اور دینا مجھے پیاس معلوم ہوتی ہے کیا موتی کل میرے پاس آئی تھی؟ مجھے خیال نہیں رہا۔"

"ہاں آئی تھی مگر تم سو رہے تھے، وہ بہت دیر تک یہاں بیٹھی تمہیں پنکھا جھلتی رہی پھر اُٹھ کر تمہارے کپڑے دھونے چلی گئی۔"

"عجیب اتفاق ہے مجھے یاد ہوتا ہے کہ میں اس وقت بھی خواب دیکھ رہا تھا کہ موتی میرے کمرے میں آنے کو ہے اور دروازہ ذرا کھل رہا تھا۔ اُس نے اور کھولنا چاہا، مگر وہ کھلا نہیں مگر ماشی میں سمجھتا ہوں تمہاری احتیاط حد سے گزر گئی تم موتی کو کم سے کم آخری وقت تو آنے دو۔ ورنہ وہ اس صدمہ کو بڑی مشکل سے برداشت کر سکے گی۔"

"بیٹا تمہارے پیر ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ لاؤ یہ شال ڈال دوں۔"

"نہیں ماشی میں کوئی چیز نہیں ڈالنا چاہتا۔"

"جوتن تم نہیں جانتے یہ شال تمہارے لئے موتی نے بنایا ہے۔ سب تو سویا کرتے وہ بیٹھی اس کو بنایا کرتی تھی۔ کل ہی تو یہ تیار ہوا ہے۔"

جوتن نے شال پر نظر ڈالی پھر محبت سے اس کو ہاتھ میں لے لیا اُسے اون کی نرمی خود موتی کا گداز جسم معلوم ہوتا تھا۔ موتی کے جذباتِ محبت گویا اُس شال کے تاروں میں راتوں کو بنتے وقت پیوست ہو گئے تھے۔ وہ صرف اُون کا ہی بنا ہوا نہ تھا۔ بلکہ موتی کے ہاتھ نے بھی اُس کو مس کیا تھا۔ اس لئے جب ماشی نے اس کے پیروں پر ڈال دیا۔ تو وہ یہ محسوس کرتا تھا۔ کہ گویا موتی کا ہاتھ اس کو تھپکتا۔ تسلی دیتا۔

دُہرایا کرتا ہے۔

" مگر ماشی میں سمجھتا ہوں موتی کو تو بننا نہیں آتا۔ کم از کم اُس کا جی ایسے کاموں میں نہیں لگتا۔"

" بیٹا کسی چیز کا سیکھنا کئی دن کا کام ہے میں نے ہی سکھایا تھا۔ اور اس میں غلطیاں بھی تو بہت ہیں۔"

" ہونے دو غلطیاں ہیں تو ہمیں پیرس کی نمائش گاہ میں تو بھیجنا ہی نہیں اس وقت میرا پاؤں گرم کر ہی دیا۔"

جوئن کے دماغ نے موتی کی وہ تصویر پیش کی جبکہ وہ شال بن رہی ہے غلطیاں کرتی ہے۔ اُلجھتی ہے پریشان ہوتی ہے مگر راتوں رات استقلال سے بیٹھی کام کر رہی ہے آہ یہ کیسی دلکش و محزون تصویر تھی۔ اُس نے پھر شال میں لے لیا اور کہنے لگا۔

" ماشی کیا ڈاکٹر نیچے ہے؟"

" ہاں وہ رات کو یہیں رہے گا۔"

" اس سے کہہ دو کہ اب مجھے کو خواب آور دوا دینا فضول ہے۔ اُس سے مجھے کچھ آرام نہیں ملتا۔ اُلٹا تکلیف بڑھتی ہے مجھے جاگنے دو ماشی تمہیں معلوم ہے کہ میری شادی بیساکھ کی چودھویں کو ہوئی تھی صبح کو وہی ہوگا۔ اور وہی ستارے آسمان پر چمک رہے ہوں گے۔ موتی شاید بھول گئی ہو۔ میں اُسے یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر تم سے کہہ دیا ہے کہ ضعف کی حالت میں ذرا سا کسل... مگر نہیں ماشی میں

سچ کہتا ہوں اگر دو منٹ کے لئے موتی سے گفتگو کرنے دو تو پھر میرے سلانے کے لئے دوا کی ضرورت نہ ہوگی میں بالکل اچھا ہوں اور آج میرا دل اس درجہ مطمئن ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اسی لئے میں موتی کو بلاتا ہوں... نہیں ماشی میں تمہیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ آخر آج رات کیا ہو گیا۔ اب تک تو تم خاموش تھیں"

"آہ جوتن میں جانتی تھی کہ میرے سارے آنسو ختم ہو چکے ہیں مگر نہیں بہت باقی ہیں آہ! اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی"

"موتی کو بلاؤ میں آج کو اس کو اپنی شادی کا دن یاد دلا دوں گا۔ تاکہ کل وہ"

"اچھا میں جا رہی ہوں شمبھو دروازہ پر ہے اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو پکار لینا"

ماشی موتی کے کمرہ میں پہنچی اور اسی جگہ زمین پر بیٹھ کر بے اختیار رونے لگی۔ تو اے بدنصیب ظالم! اب بھی آ جا جس نے تجھ کو سب کچھ دیا ہے اس کی آخری تمنا بھی پوری کر دے! جو خود مر رہا ہے اس کی حالت پر تو رحم کر!"

پاؤں کی آہٹ سن کر جوتن چونک پڑا "موتی"

"میں شمبھو ہوں۔ کیا سرکار نے بلایا؟"

"موتی کو بلاؤ"

"کس کو حضور؟"

"موتی کو"

"وہ تو ابھی واپس نہیں آئیں"

"واپس؟ ... کہاں سے نہیں آئیں؟"

"سیتا رام پور سے"

"کب گئی ہیں؟"

"حضور، آج تین روز ہوئے"

فوراً ہی جوتن سر سے پیر تک ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور اس کا سر جو کہ پڑنے لگا وہ تکیہ سے ذرا نیچے کھسکا۔ اور شال کو پاؤں سے گرا دیا۔

جب ماشی بڑی دیر کے بعد واپس ہوئی تو جوتن نے موتی کا ذکر نہیں کیا۔ اور وہ اس ذکر کو بھول گیا ہے۔ یکبارگی جوتن بولا۔

"ماشی نہیں میں نے اس خواب کا حال سنایا تھا۔ جو کل میں نے دیکھا تھا؟"

"کون سا خواب؟"

"کہ موتی دروازہ کھول رہی ہے اور دروازہ ایک انچ سے زیادہ نہیں کھلا اور وہ باہر ہی کھڑی رہی اور اندر نہ آسکی میں سمجھتا ہوں کہ اسے آخر وقت تک باہر ہی کھڑا رہنا پڑے گا۔"

ماشی چپ رہی وہ سمجھ گئی کہ جوتن کو جو سبز باغ وہ جھوٹ سچ بنا کر دکھا رہی تھی۔ یکبارگی غائب ہو گیا ہے۔ مشیت ایزدی سے لڑنا بے سود ہے اور جب مصیبت آجائے تو سر تسلیم خم کرنا ہی

بہتر ہے۔

"ماشی مجھے جو تم سے محبت ہے ہر جنم میں میرے ساتھ رہیگی میں نے اس زندگی میں اسے جمع کر لیا ہے کہ وہ اگلی زندگیوں میں میرے پاس رہے اگلے جنم میں یقیناً تم میری ہوگی اور میں انتہائے محبت سے تمہاری پرورش کرونگا۔

"جوتن۔ اب سو رہو۔ باتیں کر چکے"

"میں تمہارا نام لکشمی رکھوں گا"

"مگر یہ تو پرانے زمانے کا نام ہے"

"ہاں مگر تم بھی تو پرانے زمانہ کی ماشی ہو"

"نہیں میں لڑکی ہو کے تمہارے گھر کیلئے مصیبت نہ ہونگی"

"ماشی کیا میں مصیبتوں کے برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں کیا تم چاہتی ہو کہ ہمیشہ تم میری مصیبت ہلکی کرتی رہو؟

"پیارے جوتن میں عورت ہوں اور اس لئے کمزور۔ یہی وجہ ہے کہ ساری عمر تم کو تکلیف سے بچانے کی کوشش کی مگر نتیجہ کیا نکلا۔

"ماشی وہ کون ہے! کون ہے؟

"کون! وہاں تو کوئی نہیں"

"مگر مجھے تو صاف نظر آرہا تھا کہ وہ..."

"نہیں جوتن کچھ نہیں۔ خاموش رہو ڈاکٹر آرہا ہے"

"دیکھئے آپ کو بیمار کے پاس آنا بیٹھنا نہیں چاہیئے آپ جایئے آرام کیجئے میرا اسسٹنٹ یہاں رہیگا۔"

"نہیں ماشی! میں نہ جانے دونگا۔"

"اچھا، بیٹا میں یہاں کونے میں چپ بیٹھی رہونگی۔"

"نہیں نہیں تم میرے پاس ہی بیٹھی رہو، میں نے تمہارا ہاتھ نہ چھوڑوں گا میں نے تمہارے ہی ہاتھ سے پرورش پائی ہے اور اسی ہاتھ سے کھلوان مجھ کو لے گا۔"

"بہت اچھا۔ آپ یہاں رہیئے۔ مگر جوتن بابو آپ باتیں نہ کریں دوا پی لیجئے وقت ہو گیا ہے۔"

"میرے لئے دوا! فضول بالکل فضول جس کا وقت ختم ہو گیا اُس کو دوا پلانا محض دھوکا دینا ہے! علاوہ اس کے مجھے موت سے ہراس نہیں ماشی موت اپنے کام میں مشغول ہے۔ پھر اس ڈاکٹر کی مصیبت کیوں بلائی ہے بھیجدو۔ اسے بھیجدو مجھے اب صرف تمہاری ضرورت ہے۔ اور کسی کی نہیں! خواہ کوئی ہو مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ اب دھوکا اور فریب کا وقت نہیں رہا۔"

"سنئے صاحب میں بہ حیثیت ڈاکٹر کے آپ کے اس ہیجان جذبات کو سخت تردد کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔"

"ڈاکٹر جا میرے تردد بڑھانے کے لئے کیوں کھڑا ہے؟ ماشی وہ گیا؟ اچھا تو اب میرے سر کو اپنی گود میں رکھ لے۔"

"اچھا بیٹا اب نیند کا خیال کرو۔"

"نہیں، ماشی مجھے سونے کو مت کہو اب اگر میں سویا تو پھر کبھی نہ اُٹھوں گا مجھے ابھی تھوڑی دیر اور جاگنا ہے۔ کیا تم آواز سنتی ہو؟ کوئی آرہا ہے؟"

(۵)

"چوتن پیارے ذرا آنکھ کھولو۔ وہ آگئی۔ ایک دفعہ دیکھ لو؟"

"کس کو دیکھوں؟ خواب کو؟"

"کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟ یہ تمہاری سونی ہے؟"

"سونی؟ کیا دروازہ کھل گیا؟"

"ہاں، بیٹا وہ تو کبھی کا کھل گیا۔"

"نہیں ماشی وہ شال ہرگز نہیں، ہرگز نہیں وہ دھوکا ہے، فریب ہے!"

"چوتن یہ شال نہیں، سونی ہے جو تمہارے پیروں پڑی ہے۔ ذرا اس کے سر پہ ہاتھ تو پھیرو۔ آہ سونی اب نہ رو۔ رونے کے لئے بہت وقت پڑا ہے۔ اس وقت تھوڑی دیر کو خاموش ہو جاؤ۔"

رحمت شکل کاتب

یادگارِ اقبال

مرتبہ

بدر احمد رہتکی

مسٹر جناح، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لعل نہرو کا
ہدیہ عقیدت اور ان کے تاثرات
حضرت علامہ اقبال مرحوم کی یاد میں

اور

ملک کے جلیل القدر شعرا کے تفکرات

معہ

تبرکات اقبال

قیمت دو روپیہ چار آنے

ناشر

آزاد بکڈپو لوہاری گیٹ لاہور

محمد حنیف پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر چھپوا کر شائع کیا۔